FEBRUARY
2024

جدید تر ادب کا اشاریہ
ماہنامہ
بیاض
لاہور

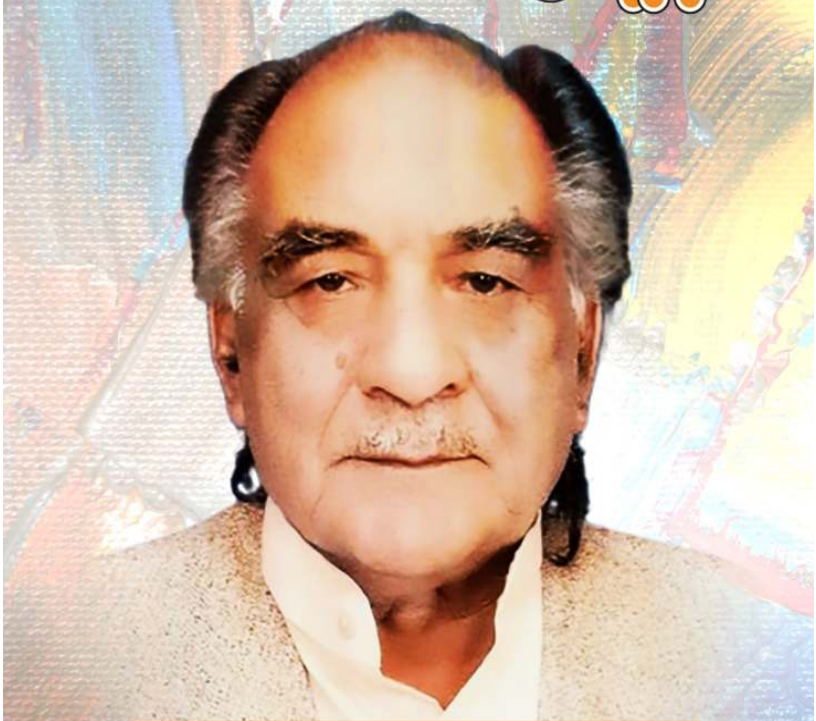

محترمہ نیلم احمد بشیر، محترمہ سلمیٰ اعوان، جناب اصغر ندیم سیّد، محترمہ بلقیس ریاض اور محترمہ صوفیہ بیدار
محترمہ بلقیس ریاض کی کُتب کی تقریبِ رونمائی

جناب سلطان سکون جناب ڈاکٹر سجاد انور کے ساتھ

جناب سلطان سکون کمشنر ہزارہ جناب ظہیر السلام کے ساتھ

جناب صہبا اختر اور جناب سلطان سکون

بانی مدیر: خالد احمد

# غزل

اَے خدا ، سمت نمائی بری سیرت کر دے
مجھ کو روشن سرِ آفاقِ محبت کر دے

کھول بادل کا دریچہ مگر اے جانِ حیا
نقش اِس آنکھ کی پُتلی پہ یہ ساعت کر دے

لوگ مبہوت کھڑے ہیں سرِ بازارِ رضا
اَے خدا ، سَوت کی اتنی مری قیمت کر دے

وسعتیں مانگ رہی ہے مری بینائی بھی
تُو یہیں رہ مگر اے جاں مجھے رُخصت کر دے

گرمیٔ قرب سے بھر دے مرا ریشہ ریشہ
یا مجھے ہجر کے صحراؤں کی حدّت کر دے

ڈوب پائے نہ کبھی میرے سخن کا تارا
اے خدا! میرے دُکھوں کو مری طاقت کر دے

آس تو سانس کی ساتھی ہے ، ابھی باقی ہے
جانے کب یہ دلِ غدّار بغاوت کر دے

خالد احمد

# We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

## THE TAQ ORGANIZATION

| Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale |
|---|---|---|

**We are a different organization in Pakistan**

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

**پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ**

**بانی مدیر: خالد احمد**

جدید تر ادب کا نقیب

ماہنامہ

# بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

**جلد نمبر: 32 - فروری 2024 - شمارہ نمبر: 2**

**مدیر اعلیٰ: عمران منظور**

**مدیر: نعمان منظور**

| مجلسِ ادارت | اعجاز رضوی | نوید صادق | کنور امتیاز احمد | جاہد احمد |
|---|---|---|---|---|

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: جناب سلطان سکون
محترمہ بلقیس ریاض کی کتب کی تقریبِ رونمائی

قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرونِ ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

**بیاض گروپ آف پبلی کیشنز**

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور - 53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے پرنٹ لائن پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

# اشاریہ


| نمبر شمار | عنوان | مصنف / مصنفہ | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| 1 | حمد | سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز | 7 تا 8 |
| 2 | نعت | جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، محمد یٰسین قمر سرور حسین نقشبندی، اعجاز دانش، نبیل احمد نبیل، فیض رسول فیضان افروز رضوی، صغیر احمد صغیر، رانا محمد شاہد، حسنین مظہری | 9 تا 19 |
| 3 | عقیدت | مرزا آصف رسول | 20 |
| 4 | رباعیات | گلزار بخاری | 21 |
| 5 | قطعات | سعد اللہ شاہ | 22 |
| 6 | گیت | خاور اعجاز، اجمل اعجاز | 23 تا 24 |
| 7 | ہائیکو | نسیم سحر | 25 |
| 8 | گوشہ سلطان سکون | مضامین<br>آصف ثاقب، عبدالوحید نیل، شاہ نواز سواتی<br>قمر زمان ، عادل سعید قریشی | 26 تا 47 |
| | | سکون کی شاعری پر اہل ادب کی مختصر آرا<br>احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، محمد ارشاد، آصف ثاقب<br>شمیم رومانی ، محسن احسان | 48 تا 51 |
| | | غزلیں | 52 تا 55 |
| 9 | افسانے | پروین عاطف، ابدال بیلا، پیروز بخت قاضی<br>ثمینہ سید ، ثانیہ انور ، نعمان حیدر حامی | 56 تا 95 |

| نمبر شمار | عنوان | مصنف / مصنفہ | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| 10 | مضامین | نثار ترابی، ضیا الحسن، ثمینہ سیّد، ظفر معین بلے جعفری<br>نبیل احمد نبیل، عرفان جمیل، شہزاد تصور، فیصل زمان چشتی<br>مسعود تنہا، کومل شہزادی | 96 تا 137 |
| 11 | غزلیں | خالد احمد، سید افسر ساجد، انور شعور، جلیل عالی، محسن اسرار<br>نسیم سحر، نثار ترابی، خاور اعجاز، سعد اللہ شاہ، راحت سرحدی<br>اقبال سروبہ، محمد انیس انصاری، عقیل رحمانی، مسعود احمد<br>ابو طالب انیم، اسلام عظمی، اکرم ناصر، اویس الحسن، طالب انصاری<br>ذکی طارق، توقیر احمد شریفی، شوکت محمود شوکت، احمد جلیل<br>اعجاز روشن، آصف شفیع، دانش عزیز، رخشندہ نوید، نائیلہ راٹھور<br>محمد نوید مرزا، اصغر علی بلوچ، عزیز عادل، ظہور چوہان، شبہ طراز<br>عابد معروف مغل، مظہر امام، مقصود جعفری، انصر حسن<br>نبیل احمد نبیل، محمد اشرف کمال، اکرم جاذب، محمود کیفی، عاصم اعجاز<br>صغیر احمد صغیر، شاہد ماکلی، خالدہ انور، شاہد فرید، سرور حسین نقشبندی<br>ملیحہ سیّد، سرور فرحان، بشیر احمد حبیب، زبیر خیالی، اکمل حنیف<br>امتیاز انجم، علمدار حسین، مستحسن جامی، راجہ عبدالقیوم<br>افتخار شوکت، کاشف حیدر، محمد اشفاق بیگ، محمد ادریس قریشی<br>عابد رضا، احمد سجاد بابر، فضل ہزاروی، رخسانہ کمن، سجاد حسین ساجد، عروج زرانی<br>روا حاصل خلوص، محمد آفتاب تابش، حمزہ یعقوب، نعمان محمود، سلیم تورانیہ<br>عبدالرؤف زین، غلام جیلانی محسن، نادیہ سحر، جیا قریشی، کوکی گل<br>میتھیو محسن، محمد علی ایاز، زاہد خان، غلام شبیر اسد، ناشط مقبول | 138 تا 215 |
| 12 | طنز و مزاح / خاکے | ممتاز مفتی | 216 تا 218 |
| 13 | آپ بیتی | شوکت علی شاہ | 219 تا 227 |
| 14 | نظمیں | ریاض مجید، جلیل عالی، حامد یزدانی، رخشندہ نوید، نیلم احمد بشیر<br>نائیلہ راٹھور، افتخار شوکت، زعیم رشید، امجد بابر، غلام مرتضیٰ<br>ساگر حضور پوری، فرح شاہد، عنبرین خان، نوید صادق | 228 تا 241 |

## حمد

حساب رکھوں تو کیسے رکھوں
حساب اعداد کی زباں ہے
یہ زاویوں اور زاپخوں میں گھرا نشاں ہے
نرا گماں ہے
فقط قیاسوں کے اسلحوں کی
بڑی کماں ہے
ہدف نشاں ہے
ہیں تیر اس کے شکار ایسے
کبھی ادھر کو کبھی ادھر کو
نشان منزل سے بے خبر ہیں
تمام اعداد کے کرشمے
نظر فریبی کے سب دریچے
گماں کے مارے
ظن اور تخمیں کے آئینے ہیں
یہ طفل مکتب کے پالنے ہیں
شمار اس کا کروں گا کیسے
میں اس کے نغمے سنوں گا کیسے
جو ماورائے حساب وحد ہے
جو مخزن خلق نیک و بد ہے
شعور دیتا ہے این و آں کا
زماں، مکاں کا
گذشتہ، آئندہ، ہر جہاں کا
جو کھلتی آنکھوں کو روشنی سے
اجالتا ہے، نکھارتا ہے
جو بند کلیوں کو رونمائی کے
مرحلوں سے گزارتا ہے
گلاب رت سے نوازتا ہے
جو روپ ان کے سنوارتا ہے
اجالتا ہے
میں اس خدا کو، حساب بے حد
گمان از حد سے ماورا کو
نظر کا جگنو بنا کے دیکھوں
تو چین پاؤں
میں راز ہستی کو جان پاؤں
میں غیر رستے سے
سب ہٹاؤں، تو جھوم جاؤں
میں اپنے دل میں خدا جگاؤں

سید ریاض حسین زیدی

# حمد

دِن طلوعِ مہر کا منظر بنا دیتا ہے کون
رات نُورِ ماہ کی چادر بچھا دیتا ہے کون

کون رکھتا ہے دیارِ شوق پر دستِ صبا
حبس کے موسم میں بھی ٹھنڈی ہَوا دیتا ہے کون

کون ہوتا ہے پسِ پردہ، گماں کی دھند میں
اور پھر سارے حجابوں کو اُٹھا دیتا ہے کون

کون ہے جس کی توجہ میں ہے ساری کائنات
اور میٹھی نیند میں اُس کو بھلا دیتا ہے کون

دشتِ ظلمت میں کرن آتی ہے کس کے حکم سے
پھر اُسے پیہم سفر کا حوصلہ دیتا ہے کون

جمع کرتا ہے کئی اطراف سے اک شاخ پر
اور پھر اِک دِن پرندوں کو اُڑا دیتا ہے کون

کس سے پردہ ہائے آگاہی میں ہے اِک ارتعاش
رفعتِ افلاک سے ہم کو صدا دیتا ہے کون

ایک روحِ بے کراں جو ماورا ہم سب سے ہے
مرکزِ انوار جس کا رابطہ ہم سب سے ہے

**خاور اعجاز**

# نعتؐ

نہ دیکھ پائے مکمل اُسےؐ نظر کوئی
بشر ہے وہؐ بھی پر اُسؐ سا کہاں بشر کوئی

لیے ہوئے ہے وہ اپنے حصارِ رحمت میں
کسی بھی صرصرِ شر کا نہیں ہے ڈر کوئی

وطن سے گنبدِ خضرا تلک مسافت میں
درونِ دل رہا جاری جدا سفر کوئی

وہ پورے صدق سے سیرت کو رہنما کر لے
جو چاہتا ہے دلوں میں بنا لے گھر کوئی

وہ خود بھی برجِ بصیرت فروز ہو جائے
جو پیشِ حکمتِ دوراں جھکا دے سر کوئی

نہ ربطِ حرف و حرا وا ہوا اگر دل پر
تو آئے کیسے کسی سطر میں اثر کوئی

یہ بزمِ نعت ہے عالی حدودِ عجز میں رہ
روا نہیں ہے یہاں دعویِ ہنر کوئی

جلیل عالی

# نعتؐ

[حفیظ تائبؒ کی روح پرفتوح کی نذر]

کرب، رنج و الم کی تھی تکلیف
انؐ کے لطف و کرم سے ہے تخفیف

سر اٹھا کے سکھا دیا جینا
اپنے پاؤں پہ چل رہے ہیں ضعیف

سرکشوں کی تو اور ہے دنیا
آپؐ کا بے ادب ہے میرا حریف

آپؐ کا جو بھی دم بھرے آقاؐ!
میرا ہم دم ہے اور میرا حلیف

پتھروں کو گداز دیکھا ہے
عاجزی کو عطا ہوئی تالیف

ایک امی لقب کا معجزہ ہے
اُتری قرآں کی آپؐ پر تصنیف

وہ اٹھائے مزے جہانوں کے
جس زباں پر ہو آپؐ کی توصیف

آگہی کا ہنر ہے اس کے پاس
ان سے منسوب ہے جو دینِ حنیف

روح کی وادیاں مہکتی ہیں
آپؐ کا ذکرِ پاک ایسا لطیف!

مدحتوں کے ریاض کھلنے لگیں
آپؐ لے آئیں گے جہاں تشریف

سید ریاض حسین زیدی

# نعت

میرے وجدان نے اک روشنی پائی کیسی
نعتِ سرکارؐ مرے دل میں سمائی کیسی

نکہتِ صلِّ علیٰ ہر در و دیوار سے آئے
تو نے اے شوق! یہ بستی ہے بسائی کیسی

سوچتا جاؤں میں قرآن کو پڑھتا جاؤں
ایک ہستی یہ مرے ذہن میں آئی کیسی

بزمِ آفاق ہوئی رُشد و ہدیٰ سے پُرنور
شمعِ عرفان پیمبرؐ نے جلائی کیسی

اُن کے ممنون ہیں تہذیب، تمدّن، حکمت
آپؐ نے دیکھیے، کی، عقدہ کشائی کیسی

اُن کی محفل میں رہے پست ہماری آواز
اُنؐ کی تعظیم مرے رب نے سکھائی کیسی

نیّرِ حب نبیؐ سے ہے تو روشن اے دل!
دیکھ قسمت نے تری بات بنائی کیسی

شاہِ ابرار نے تقویٰ کی ضیا دے کے قمر
رنگ اور نسل کی تفریق مٹائی کیسی

محمد یٰسین قمر

# نعتؐ

ہر نیا سال جب بھی آتا ہے
نعت کا زمزمہ سناتا ہے

عیسوی سال ہو کہ ہجری ہو
ان کے قدموں سے فیض پاتا ہے

اسمِ احمد میں ہے مٹھاس اتنی
نطق میں شہد گھلتا جاتا ہے

ہر زمانہ مرے نبی کا ہے
ہم کو قرآں یہی بتاتا ہے

ذکر ان کا مرے تخیل کو
نت نئی روشنی دکھاتا ہے

آنکھ کے روزنوں میں شام و سحر
سبز گنبد ہی جھلملاتا ہے

لوٹ کر ان کے شہر سے آنا
تشنگی اور بھی بڑھاتا ہے

خیر ہی بانٹیے زمانے میں
ان کا اسوہ یہی سکھاتا ہے

ہر نیا سال شکر ہے سرور
حاضری کا پیام لاتا ہے

سرور حسین نقشبندی

# نعتؐ

ظلمتوں کا ازالہ ہمارا نبی
دو جہاں کا اجالا ہمارا نبی

کیوں نہ ہر اک گنہگار مسرور ہو
بخششوں کا حوالہ ہمارا نبی

معجزے لے کے آئے تھے سارے نبی
معجزہ بن کے آیا ہمارا نبی

ایک سے ایک آئے جہاں میں حسیں
سب حسینوں میں یکتا ہمارا نبی

زلف واللیل روئے حسیں والضحیٰ
جس کا یاسین سہرا ہمارا نبی

ہے لقب ان کا قرآں میں خیرالبشر
ہے رسولوں میں اعلیٰ ہمارا نبی

چاہِ نمکیں کو شیریں کیا آپ نے
شہد سے بھی ہے میٹھا ہمارا نبی

سب رسولوں کو بخشا خدا نے عروج
عرشِ اعظم پہ پہنچا ہمارا نبی

جو بھی چوکھٹ پہ آیا یہ کہتا گیا
"دینے والا ہے سچا ہمارا نبی"

فکر کوئی اسے کیوں ہو لاحق بھلا
جس کا خود ہو سہارا ہمارا نبی

نامِ نامی ہے ہر لا دوا کی دوا
جانِ جاناں مسیحا ہمارا نبی

اب تو دانش وظیفہ ہے میرا یہی
سب سے پیارا ہمارا ، ہمارا نبی

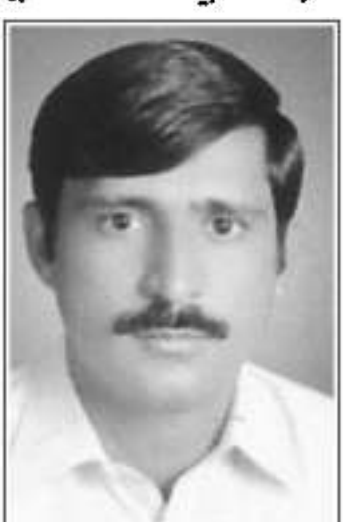

اعجاز دانش

# نعتؐ

جب بھی آئے ذکرِ سرور دیکھنا اور سوچنا
اپنی پلکوں کو جُھکا کر دیکھنا اور سوچنا

آپؐ محبوبِ خُدا ہیں، آپؐ مطلوبِ اُمم
عظمتِ شانِ پیمبر دیکھنا اور سوچنا

فیض جاری ہو گیا کس کی نگاہِ شوق کا
جب ہٹیں رستے کے پتھر دیکھنا اور سوچنا

کس قدر آنکھوں میں بستی جا رہی ہے روشنی
شہرِ پیغمبرؐ کا منظر دیکھنا اور سوچنا

جب عطا ہو اُس طرف سے باریابی کا شرف
کس طرح چمکا مقدر دیکھنا اور سوچنا

غور کرنا آپؐ کے لُطف و کرم پر ہر گھڑی
رحمتیں اُنؐ کی برابر دیکھنا اور سوچنا

کیسے کُھلتا ہے نگاہوں پر درِ لُطف و کرم
شاد میں آنسو بہا کر دیکھنا اور سوچنا

دے رہا ہے بے بصیرت آنکھ کو بھی روشنی
رفعتِ محراب و منبر دیکھنا اور سوچنا

اِک چٹائی میں بھی ہیں عرشِ علیٰ کے معجزات
کملی والے کا وہ بستر دیکھنا اور سوچنا

ماہِ تاباں سے ہے بڑھ کر رُوئے انور آپؐ کا
اے نبیلؔ آنکھوں میں لا کر دیکھنا اور سوچنا

نبیل احمد نبیلؔ

# نعت

ہم آقا کی محفل سجانے لگے ہیں
مدینے کے ہم گیت گانے لگے ہیں

خیالوں میں چمکا ہے چاند آمنہؓ کا
"تصور مرے جگمگانے لگے ہیں"

جنہیں حق نے توفیق دی ہے مبارک
دُرودوں کا وہ فیض پانے لگے ہیں

زیارت کا موسم قریب آرہا ہے
حضوری کے پھر خواب آنے لگے ہیں

چلو میکشو ! حوضِ کوثر پہ سارے
سُنا ہے کہ وُہ خود پلانے لگے ہیں

جنہیں ہجرِ طیبہ ہی کافی ہے دیکھو
وُہ سارے غموں کو بھلانے لگے ہیں

لحد میں تو جی بھر کے دیدار کر لُوں
یہاں آتے آتے زمانے لگے ہیں

جنہیں دیکھ کر یاد آئے مدینہ
ہمیں ایسے منظر سُہانے لگے ہیں

خُدا دیتا ہے مصطفیٰؐ بانٹتے ہیں
ہمیں ہاتھ کیا کیا خزانے لگے ہیں

یہ عشقِ نبی کی ہے فیضانؔ برکت
دیوانے بھی یکتا یگانے لگے ہیں

فیض رسول فیضان

# نعتؐ

دلنشیں ہے، مہرباں ہے، آپ ہی کی ذاتِ پاک
کلمۂ حق کا بیاں ہے، آپ ہی کی ذاتِ پاک

آپ کو بھیجا خدا نے، رحمتیں کر دیں تمام
امتی پر مہرباں ہے، آپ ہی کی ذاتِ پاک

کلمۂ حق میں ہے شامل نامِ نامی آپ کا
"وجہِ تخلیقِ جہاں ہے، آپ ہی کی ذاتِ پاک

سارے نبیوں پر فضیلت آپ ہی کا وصف ہے
کیونکہ قرآں کا بیاں ہے، آپ ہی کی ذاتِ پاک

نور کی چادر میں لپٹی ہے یہ ساری کائنات
کر رہی جو ضوفشاں ہے، آپ ہی کی ذاتِ پاک

سر بہ سجدہ ہوں کہ میں بھی آپ کی امت میں ہوں
کیوں کہ افروزِ جہاں ہے، آپ ہی کی ذاتِ پاک

افروز رضوی

# نعتؐ

پڑھتا رہتا ہوں صغیر ان کا قصیدہ دل سے
دور ہو سکتا نہیں پل بھی مدینہ دل سے

میرے آقا اسے خود پاس بلا لیتے ہیں
کر کے دیکھے تو سہی کوئی ارادہ دل سے

ایک دن پھر سے میں جاؤں گا ریاض الجنۃ
خود کو دیتا ہوں میں اکثر یہ دلاسہ دل سے

آپ کو دیکھے بنا آپ کا ہو جاتا ہے
جو بھی اک بار پڑھے آپ کا اسوہ دل سے

مرے شاہا میں ترے جود و سخا کے صدقے
دیکھ سکتا ہوں جو میں گنبدِ خضریٰ دل سے

بابِ جبریل کی اک بار زیارت کی تھی
دیتا رہتا ہوں اسے اب بھی میں بوسہ دل سے

اس نے ہر غم سے رہائی کی ضمانت پائی
جس نے مانا مرے آقا کو مسیحا دل سے

صغیر احمد صغیر

# نعتؐ

ان کی چوکھٹ جو کبھی میں نے نہ خالی دیکھی
ساری دنیا ہی اسی در کی سوالی دیکھی

اُس کی نظروں میں نہیں اِس سے حسیں تر منظر
جس کسی نے بھی ترے روضے کی جالی دیکھی

بے زروں کو بھی بنایا ہے ابوذرؓ دیکھو
ان کے دربار کی ہر ریت نرالی دیکھی

تو کہاں اور کہاں مجھ سے بشر خاکی ہیں
ہے غلاموں کی ترے، شان بھی عالی دیکھی

کیا کرے بات، تری بات کی ، کوئی شاہد
ہم نے ہر بات میں اک بات نرالی دیکھی

رانا محمد شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک خوشبو سے مہک رہے ہیں آئینہ خانے
زینہ زینہ، نس نس اُتری ، چاہت کی مہکار

# نعتؐ

اسمائے شہِ دین کی تکریر سے تقدیر
بنتی ہے فقط ایک ہی تدبیر سے تقدیر

جو شخص ہوا اذنِ مدینہ سے شرف یاب
مَس کرتا ہوں اُس شخص کی تقدیر سے تقدیر

تازہ ترے اذکار کے عرفان سے اذہان
روشن ترے انوار کی تنویر سے تقدیر

جو کھینچ لیے جائے مجھے شہرِ نبی تک
باندھوں گا اُسی حلقۂ زنجیر سے تقدیر

تعمیل سے کھلتے ہیں مقدر کے سبھی بل
کھلتی نہیں اوراد کی تکثیر سے تقدیر

کھینچا تھا جو اک بار سرِ ہجرِ مدینہ
یاور ہوئی اُس نالۂ شب گیر سے تقدیر

ہر آن رکھو وردِ زباں نامِ محمدؐ
بن آئے گی اس نام کی تاثیر سے تقدیر

حسنین مظہری

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پل کے پل، بس ایک جھلک، اے آقا، اے آقا!
دم کے دم، اے میرے رہبر، اے میرے سردار!

# مدینے میں

ہے لمحہ لمحہ جہاں بخت ور مدینے میں
عطا مجھے بھی ہوں شام و سحر مدینے میں

درِ حضور سے ہوں دور کیوں میں بے مایہ؟
ہے میرا سیم مدینے میں، زر مدینے میں

زہے تصورِ طیبہ! میں جاؤں خود جب بھی
ہیں مجھ سے پہلے مرے دل نظر مدینے میں

درختِ عینِ یقیں لا الـــہ الا اللـــہ
ہوا ہے دیں کے لیے باثمر مدینے میں

انہی سے تا بہ ابد حج و کعبہ کی رونق
جو ذکر و فکر ہوئے حق نگر مدینے میں

خرد کرشمہ نمائے جہاں سہی لیکن
خرد کو ملتی ہے دل کی نظر مدینے میں

ہے کیا شرف! سرِ سبحان ربی العلی
ہے بڑھ کے اس سے بھی جب خم ہو سر مدینے میں

ہے کیفِ سایۂ طوبیٰ بھی جس کے سائے میں
ہے نازِ باغِ ارم وہ شجر مدینے میں

زمیں سے اڑ کے بشر کائنات بھی پھر لے
بنے گا آخری منزل سفر مدینے میں

گزارشوں کی وہ تفصیل اب سناؤں کیا؟
جو آنسوؤں نے ہے کی مختصر مدینے میں

فقط ردیف نہیں یہ ہے کیفیت ، آصف!
دل و نگاہ پہ تحریر کر "مدینے میں"

مرزا آصف رسول

## رباعیات

ہندی نے سجایا ہے جہانِ اُردو
ٹھہری عربی شوکت و شانِ اُردو
پھر فارسی نے اس کو بنایا ہے مثال
یکتا ہوئی دنیا میں زبانِ اُردو

.....

کہلائے ولی مرشدِ ارباب سُخن
کہتا ہے وہی محرم آدابِ سخن
در تازہ مضامین کا ہوتا نہیں بند
تا روزِ قیامت ہے کُھلا باب سخن

.....

جذبات سے ہر قلب کو زنجیر کیا
آفاق محبت ہی سے تسخیر کیا
اُردو کے لیے فخر بنا میر تقی
خالق نے اسے ریختہ کا میر کیا

.....

گنجینۂ معنی کا وہ قالب ہی رہا
فن اس کا نئی طرز کا طالب ہی رہا
مغلوب اسے کر نہیں پایا کوئی
غالب اسد اللہ تھا غالب ہی رہا

.....

حب دارِ علی عاشقِ شبیر انیس
ہے مدح گرِ عطرتِ تطہیر انیس
میدان رثا میں نہیں ثانی اس کا
ہے مرثیہ گوئی کا شرف میر انیس

یا برقِ بلا گرتی ہے رعد آتا ہے
مشکل سے کوئی موسمِ سعد آتا ہے
جلدی سے نہیں بخت سنورتے دیکھے
اقبال بڑی دیر کے بعد آتا ہے

.....

ہوتی ہے ادھر ہار جدھر پانچ نہ ہوں
وہ عبد ہی کیا جس میں ہُنر پانچ نہ ہوں
پہچان ہیں بندے کی حواسِ خمسہ
بنتی ہی نہیں بات اگر پانچ نہ ہوں

.....

سچا ہے وہی سچ کو جو تسلیم کرے
لیکن کسی کاذب کی نہ تکریم کرے
ہے پانچ نمازوں میں یہ نکتہ پنہاں
لازم ہے بشر پانچ کی تعظیم کرے

.....

دنیا کے لیے لازمی دم پانچ کا ہے
بہتے ہوئے دریاں میں نم پانچ کا ہے
معلوم ہے پنجاب کے حُب داروں کو
پنجاب کے خِطے پہ کرم پانچ کا ہے

.....

احسان و عنایات کی حد کرتے ہیں
دعوے کے لیے پیش سند کرتے ہیں
کرتا ہے یہ ہر ہاتھ کا پنجہ ظاہر
کوئی نہ کرے پانچ مدد کرتے ہیں

**گلزار بخاری**

# قطعات

## سیاست کا چلن

اچھا اگر ہو کوئی بھی یا وہ برا نہیں
اس کی کسی بھی پارٹی میں کچھ جگہ نہیں
کوئی بھی باضمیر ہو سوچے گا وہ ضرور
جو بولتا ہے سچ وہ یہاں با وفا نہیں

## Oh I See

نکالے کون انہیں ریشمی لبادوں سے
نکلنا ہوگا بہت آگے اب ارادوں سے
او آئی سی بھی ہماری ہے اوہ آئی سی
غلام کیا کریں بڑھ کر قراردادوں سے

## ریلے ریس

انصاف کا تقاضا ہے سب کو ملے سزا
صرف ایک پر ہی کس لئے یہ توشہ خانہ کیس
کس کو خبر نہیں کہ سبھی لوٹتے رہے
یعنی کہ لوٹ مار کی ان میں تھی ریلے ریس

## رہنما

اے مرے راہنما تو ہے سفیدے کا درخت
پانی پی کر بھی ثمر بار نہیں ہوتا ہے
تیری لکڑی بھی اگر ہے تو جلانے والی
تیرا تعمیر میں کردار نہیں ہوتا ہے

## ایک خیال

یہ حکمتوں کی باتیں ہیں کس کو بتائیں یار
ایسا بھی وقت آتا ہے ہوتا ہے پھول خار
کس کی مجال ہے کہ چلے سعد اس کے ساتھ
یہ دل تو ایک دن میں دھڑکتا ہے لاکھ بار

## ورلڈ کپ فائنل

تبدیل کرتا رہ گیا پچوں کو انذیا
اس کے سپورٹروں نے بھی کیا کچھ نہیں کیا
سارے ہی ناز نخرے دھرے کے دھرے رے
اور کپ اٹھا کے لے گیا سعد آسٹریلیا

ایک بھی شعر نہ کہہ پایا وہ
شاعری کوزہ گری تھی جس کو
شاعری سعد ہنر سے ہے ورا
یہ ودیعت ہے بتائیں کس کو

## بنگلور کی فتح

بنگلور میں جو چھکوں کی برسات ہوگئی
بابر نے حاسدوں کے بھی ہوش اڑا دیے
کیا ذکر اپنے فخر کے چھکوں کا ہم کریں
اس نے تو نیوزی لینڈ کے چھکے چھڑا دیے

## خطرناک شخص

ہے استعارہ خوف کا جو شخص بند ہے
اور ڈر رہے ہیں اس سے کہ جو ہیں کھلے ہوئے
ایسا نہ ہو کہ فخر کی صورت وہ کھیل جائے
ہیں جس کو روندنے۔ کے لئے سب تلے ہوئے

سعد اللہ شاہ

# گیت

بجلی کوندرہی ہے سر پر
بادل ہیں گھنگھور
باہر چپ کا سناٹا ہے
اندر گہرا شور
سپنا دیکھتے دیکھتے نکلی
ہاتھ سے دِل کی ڈور
پھر بھی ہم اس کے ہمراہی
دل پر کس کا زور
ظاہر باطن دو دُنیائیں
بیچ کھڑی دیوار
بھید محبت والا آخر
کس پہ ہُوا اشکار
کتنا جان چکے دُنیا کو
لیکن سب بے کار!

خاور اعجاز

# گیت

اک ذرا تھم جا اے دلِ ناشاد!
آج پھر آ رہی ہے اُس کی یاد
تھا وہ معصوم، خوب صورت تھا
پوجنے والی ایک مُورت تھا
میرے جیون کی اک ضرورت تھا
کر لیا اُس نے اک نگر آباد
آج پھر آ رہی ہے اس کی یاد
اک ذرا تھم جا اے دل ناشاد!

رفتہ رفتہ اُسے بُھلا دوں گا
آس کا دیپ اب بجھا دوں گا
یاد کو دل میں ہی سُلا دوں گا
تو بھی سو جا، اب اے مرے ہم زاد!
آج پھر آ رہی ہے اُس کی یاد
اک ذرا تھم جا اے دل ناشاد!

کس کی یادوں میں اَب دھڑکتا ہے
آس کا پنچھی کیوں پھڑکتا ہے
سُوکھا پتا کوئی کھڑکتا ہے
چونک جاتا ہے کیوں دلِ برباد
آج پھر آ رہی ہے اُس کی یاد
اک ذرا تھم جا اے دل ناشاد!

اجمل اعجاز

# ہائیکو

نسیمِ سحر

دھوپ میں رہ کر بھی
ہم نے کیسے سیکھ لیا
سایوں سے ڈرنا

☆

کان میں رس گھولے
چشمے کی رم جھم رم جھم
پیتم یوں بولے

☆

دکھ کی بینا کے
کان لگا کر سنئے گا
سب سُر ہیں سچے

☆

سوکھی ٹہنی ہے
موسمِ گُل کی برکت سے
سونی رہنی ہے

☆

بیٹھ کر اُس کے رُوبرو لکھوں
چاہتا ہوں کہ مَیں اُسی جیسا
خوب صورت سا ہائیکو لکھوں

# ہمارا سکون پیارا سکون

حرفِ سکون نوک قلم پر ہو تو جذبات کی وسعت کا ٹھکانا نہیں ہوتا میں ہمدم دیرینہ سلطان سکون کے تحریری کارناموں کے خصوص میں لکھنے بیٹھا ہوں تو میرے قلم کے سامنے حیرتوں، مسرتوں اور محبتوں کے اَن گنت الفاظ گھوم پھر رہے ہیں۔ سلطان سکون سے میری دوستی کو ایک زمانہ ہو گیا ہے ہم دکھ سکھ کے شریک زندگی کا بڑا حصہ ایک ساتھ گزار کر چکے ہیں۔ میرے آنسوؤں کو انھوں نے گہر بار کیا ان کے آنسوؤں کو میں نے آنکھوں پر چمکایا۔ ہماری دوستی کی مثال نہیں ملتی ہم ایک دوسرے پر صدقے قربان ہوئے - اب وہ ایبٹ آباد میں فروکش ہیں اور میں بوئی میں گوشہ نشیں۔ وہ جب یاد آتے ہیں تو میں ان کی کتابیں پڑھتا ہوں۔ سلطان سکون کی غزلوں کا اسلوب تکلم جھرنوں کا ترنم اور صنوبروں کی ہواؤں کا سوز و ساز رکھتا ہے۔ ان کا تغزل ڈکشن سے ممتاز اور لہجے سے سرافراز ہے۔

ہزارے کے ادبی سرمائے میں سلطان سکون کی غزلوں کے کئی شعر جگمگا رہے ہیں جن کی چمک دمک سے ذوقِ سلیم شعر فہمی کی درست سمتیں متعین کرتا ہے - وہ پرافشاں نہیں نکلتا بلکہ پیوست ہو کر لہو میں ایسا ارتعاش پیدا کر دیتا ہے جو دردمندی کے محسوسات کی بے تابیوں سے خاص ہے۔ یوں تو اچھی غزل کہنے والے بہت ہیں مگر سلطان سکون نے غزل کے لہجے کو جیسے بامراد کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ ''جدیدیت'' کی طرف زیادہ توجہ نہ کرتے ہوئے بھی سکون نے عصری تقاضوں کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جہاں سکون نے غزل میں اعلیٰ روایتوں کا التزام برتا ہے وہاں عصریت کی تازہ کاریوں کا سامان بھی کیا ہے۔

جدید فکر کو انھوں نے اپنی مخصوص شعری افتاد کے قرینے سے اپنا بنایا ہے۔ یہی ان کی غزل کی پہچان ہے۔ اور ان کے تغزل کی آبرو بھی یہ شناخت سلطان سکون کی برسوں کی ریاضت کا ثمر ہے، انھوں نے غزل کے اسلوبیاتی تناظر کو احساسِ غم کے وضع کردہ دستور کی طرح برتا ہے۔ اس ضمن میں ان کا اخلاص غزل کا دردمند لہجہ بن کر سامنے آتا ہے، کہ ان کی اپنی زمینوں میں غزل کی

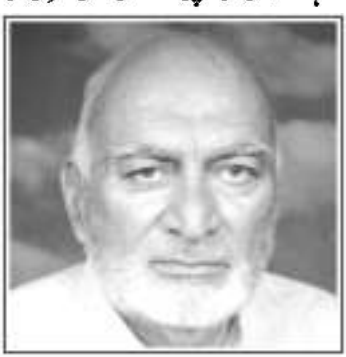

آصف ثاقب

جناب خالد خواجہ، جناب سلطان سکون اور جناب انور خواجہ۔

تدوین عمدگی سے ہو رہی ہے ان کی اپنی اور ذاتی کئی شعری ندرتیں مل کر حسنِ تغزل استوار کرتی نظر آتی ہیں بقولے کڑے سے کڑے انتخاب میں سلطان کی غزل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نرماہٹ دھیمی دھیمی آہٹ اور گنگناہٹ دل پر اثر انداز ہو کر رہتی ہے۔ سلطان سکون کی افتادِ طبع سے خصوصیت رکھنے والی بحریں زیادہ نہیں تاہم ان بحروں میں انھوں نے خوب رنگ جمایا ہے۔ ایک بحر سے سلطان سکون کے تین مطلع درج ہیں:

درخت کٹتے گئے اور مکان بنتے گئے
ہمارے سر پہ کئی آسمان بنتے گئے

وہ عمر بھر کی رفاقت کا اتنا پھل دے گا
دکھوں پہ صبر کی تلقین کر کے چل دے گا

کوئی نہ کوئی تو تحفہ ضرور گھر لے جا
نہیں کچھ اور تو چہرہ شگفتہ تر لے جا

☆☆☆☆☆

جناب احمد حسین مجاہد، جناب سلطان سکون، جناب احمد ریاض، جناب احمد عطاء اللہ اور جناب اعجاز نعمانی۔

# سلطان سکون ایک کہنہ مشق شاعر و ادیب

جناب سکون کا سات دہایوں سے زیادہ عرصے پر محیط ادبی منظر نامہ، ان کی طبیعت میں عاجزی اور انکساری، فقیرانہ طرزِ زندگی، صحت مند مشاغل اور احباب سے میل جول میں بلا کا رکھ رکھاؤ اور طرزِ تکلم میں سمندر کا سا ٹھہراؤ دیکھ کر بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ آپ ہزارہ کے ادبی افق پر چمکنے والے اس ستارے کی مانند ہیں جس کی لو سے ارد گرد اور آس پاس کے بہت سے ادبی و علمی مناظر منور ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

جناب سکون جہاں ایک پیر مرد جہاں دیدہ ہیں وہیں بلند پایہ شاعر، ادیب اور دانشور بھی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ آپ اپنی اسلامی اور ثقافتی اقدار کے پاسبان اور حلقہِ احباب میں ایک نمایاں مقام رکھنے والی شخصیت کے طور پر دور دور تک جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ویسے تو ان کا تعلق ایبٹ آباد کے مغرب میں کوئی بیس کلو میٹر کے فاصلے پر ایک خوبصورت گاؤں ''عید گاہ نزد کوٹھیالہ'' سے ہے مگر وہ اپنی اوائل عمری میں ہی ایبٹ آباد شہر منتقل ہو گئے تھے جہاں اپنے اہل و عیال کے ساتھ ابھی تک رہائش پذیر ہیں۔ علم و ادب کا دلدادہ یہ گھرانہ بس یوں جانیے کہ ہر ہر قدم پر اپنی علمی خدمات بہم پہنچا رہا ہے کیوں کہ وہ خود بھی محکمہ تعلیم سے ایک وسیع تعلق نبھانے کے بعد ایک اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہوئے اور پھر ان کر گھرانے کے بیشتر افراد بھی اس ادارے کے توسط سے ملک قوم کو علمی خدمات پیش کر رہے ہیں۔ بات الگ کہ جناب سکون کا شخصی حوالہ ان دنیاوی تعریفوں اور خوبیوں سے کچھ بڑھ کر ہے۔ راقم کا ان کے ساتھ گذشتہ دو دہایوں سے زندگی کے تقریباً ہر اہم شعبے میں ذاتی تعلق اور واسطہ رہا ہے لہٰذا بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جناب سلطان سکون دوستوں کے دوست، بھائیوں کے بھائی اور بے لوث و بے طمع، نہایت سلجھی ہوئی شخصیت اور نرم و گداز طبیعت کے حامل ہیں۔ ان کے ساتھ بات کرتے ہوئے کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ بندہ ایک بین الاقوامی شہرت اور صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی کے حامل شاعر و ادیب سے مخاطب ہے بلکہ انھیں اپنا ہمدرد اور خیر خواہ پاتے ہوئے ہر دوست، رشتہ دار اور جان پہچان رکھنے والا بہ آسانی سیر حاصل گفتگو بھی کر سکتا ہے اور ان کے دیرینہ تجربات، مشاہدات اور مشاغل سے کشیدہ مے علم و دانش سے مسرور بھی ہو سکتا ہے۔ لہجے کے دھیمے پن کا سحر اور ہلکے پھلکے مزاح کی چاشنی گفتگو کی اضافی اہمیت کو اجاگر کر دیتی ہے۔ اس حوالے سے، سچ پوچھیے تو، ان کے ہمدم دیرینہ محترم پروفیسر آصف ثاقب ہی بات مکمل کر سکتے ہیں۔

ادبی دنیا میں کسی اہلِ قلم کی پہچان اس کے قلم کی روانی، تحریر کی شائستگی، خیال و فکر کی بالیدگی، جذبے کی شدت، الفاظ کی اثر پذیری، لہجے کا انفراد، اس کے فن پارے کی اثریت اور عصریت، فی زمانہ ضرورت اور اہمیت اور اس سے بڑھ کر اس کی نفوذ پذیری سے ہوتی دیکھی جا سکتی ہے اور اس حوالے سے جناب سکون اپنا ایک خاص مقام اور پہچان رکھتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے محض وقت گزاری اور شوق پورا کرنے کے

عبدالوحید بسمل

لیے اپنا قلم نہیں اُٹھایا بلکہ وقت اور معاشرے کی اشد ضرورت کو پیشِ نظر رکھا اور ان موضوعات کو اپنا محورِ تخلیق و تالیف بنایا جو آج اور آنے والے کل کی شدید ضرورت کے طور پر گردانے جا سکتے ہیں۔

اس خصوص میں ان کی ادبی کاوشوں کا اجمالی تذکرہ مناسب لگتا ہے لہٰذا یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اگرچہ انھوں نے اپنا ادبی سفر گذشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی سے بطور اردو زبان کے شاعر، شروع کیا مگر جلد ہی ان کی نگاہ دور بیں نے بھانپ لیا کہ اردو کے ساتھ ساتھ اپنی علاقائی زبان ہندکو ان کی اشد ضرورت ہے جس کا ادبی خزانہ اس وقت محض لوک ادب کی حد تک باقی تھا اور وہ بھی رفتہ رفتہ اپنی شناخت بلکہ وجود تک مٹائے جا رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ہندکو زبان کے تحریری ادب پر اپنی تمام تر توانائیاں اور وسائل بروئے کار لانے کی ٹھان لی اور ماشاء اللہ اس اہم مقصد میں کامیابی کی خاطر پروفیسر جناب آصف ثاقب، جناب یحیٰی خالد، جناب محمد فرید اور چند دیگر احباب کے ساتھ مل کر "ہزارہ ہندکو ادبی سنگت" جیسی تنظیم کا قیام عمل میں لایا جس کے پلیٹ فارم سے بہت سی ہندکو شعری و نثری کتابوں کی اشاعت وقوع پذیر ہوئی۔ بعد میں جناب سکون نے اپنی ہندکو ادبی خدمات کو ذاتی حیثیت میں دیکھنا اور پیش کرنا مناسب جانا اور یوں ان کا یہ سفر رواں دواں رہا جو ابھی تک جاری ہے۔ یہاں نفسِ مضمون کا تقاضا ہے کہ ان کی تصانیف و تالیف کا انفرادی حیثیت میں مختصر جائزہ پیش کیا جائے۔

ا۔ بجھ میری بجھارت (ہندکو پہیلیاں)۔ یہ جناب سکون کی پہلی کتاب ہے جس میں ہندکو لوک ادب میں سینہ بہ سینہ چلی آنے والی ڈیڑھ سو سے زائد پہیلیاں شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی جس میں پہیلی جیسی معروف ثقافتی صنفِ لوک ادب کو جس کا بڑا حصہ ذہن میں محفوظ تھا، کتابی شکل میں محفوظ کیا گیا ہے جو کہ ہندکو بولنے اور اس سے پیار کرنے والوں کی لیے ایک تحفے سے کم نہیں۔ پہیلی کے حوالے سے زیادہ بات کرنے کی چنداں ضرورت اس لیے نہیں کہ اس کی اہمیت اور مقام سے ہر دور، علاقہ اور معاشرہ نہ صرف پوری طرح آگاہ ہوتا ہے بلکہ بچے بوڑھے بھی اپنے فارغ وقت کے بہتر استعمال کے لیے پہیلیاں بوجھواتے رہتے ہیں۔ پہیلی کے بارے میں اہلِ دانش کا خیال ہے کہ یہ نہایت اہم صنف ہے اور دنیا کے ہر خطے اور ہر زبان میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ پہیلی کا تعلق ذہانت کے امتحان سے بھی ہوتا ہے اور کہیں کہیں اشاروں اور استعاروں میں ایک فلسفیانہ روش اور رویہ بھی پایا جاتا ہے۔ یہ کسی بھی معاشرے میں بسنے والے افراد کی متحرک موجودگی کا مظہر بھی ہوتی ہے اور کسی قوم کی ذہانت اور فہم و ادراک کی چستی کا عندیہ بھی۔ جناب سکون نے ہندکو کی ابتدائی کتابوں میں ایک اہم موضوع کا چناؤ کرتے ہوئے ہندکو لوک ادب کے خزانے کو محفوظ کرنے کی سعی جمیل کی ہے۔ اس کتاب کی ایک اور اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ہندکو کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی پہیلیوں کی تشریح موجود ہے جو کہ ہر اردو، ہندکو، پنجابی پڑھنے والے کے جاننے اور بوجھنے میں معاون اور مددگار ہے۔ اس کتاب پر ملک بھر سے نامور ادبی شخصیات نے اپنے خیالات کا اظہار بصورت مکتوبات کیا۔ ان مکتوبات سے کچھ اقتباسات جناب سکون نے اپنی تیسری کتاب "چن چودھویں رات" کے آخر میں شامل کر کے قارئین

کے مطالعے اور کتاب کی اہمیت کو سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی ہے۔

۲۔ کاری دی گل (ہندکو حکایات): یہ کتاب ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی جس میں پند و نصائح کی حامل لوک کہانیاں، اقوالِ زریں، اور کچھ محاوروں کے ساتھ منسلک نصیحت آموز واقعات اور مثالیں شامل ہیں۔ ایک عام مطالعے کے بعد ایسا نظر آتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کا بڑا مقصد معاشرتی و اخلاقی اصلاح ہے اور ان کہانیوں کے پس منظر میں کسی حد تک شیخ سعدیؒ اور مولانا رومیؒ کی حکایات اور کہیں کہیں ملا نصیر الدین سے منسوب لطائف و واقعات جیسا اصلاحی پہلو جھلکتا ہے۔ کتاب میں پیش کی گئی زیادہ تر کہانیوں اور دیگر مواد کا مخرج ہندکو لوک ادب اور لوک وژڈم ہی نظر آتا ہے۔ یہ ایک شاندار کتاب ہے جس کے بغور مطالعے سے زندگی کے مختلف رنگوں اور مواقعوں پر اپنا طرزِ عمل درست رکھنے اور کوئی بات کرنے سے پہلے اس کے جملہ ممکنہ اثرات، فوائد، نقصانات اور نتائج پر نظر رکھنے کی ترغیب ملتی ہے۔

اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے سے ہندکو ادب کو ایسی تقویت نصیب ہوئی کہ جو لوگ ہندکو اہلِ زبان ہونے کے باوجود عام بول چال، خصوصاً دفتروں اور محفلوں میں ہندکو بولنے سے ہچکچاتے تھے وہ بھی ہندکو نثر پر توجہ دینے لگے اور آج، ماشاءاللہ، ہندکو میں شاید ہی کوئی ایسی صنف ہو جس پر کتاب موجود نہ ہو۔

۳۔ چنو چودھویں رات (ہندکو پہیلیاں) یہ کتاب جناب سلطان سکون کی پہلی کتاب بجھ میری بجھارت کا تسلسل سمجھی جا سکتی ہے کہ اس کتاب میں شامل پہیلیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی پہیلیاں تھیں مگر پہلی کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں۔ یہ سکون صاحب کی ہمت اور حوصلہ ہے کہ انھوں نے بغیر کسی فرد یا ادارے کی اعانت کے، اپنے طور پر ہی یہ کام جاری رکھا اور اب بھی جاری ہے کہ جہاں کہیں اور جس طور کوئی کہاوت، مثل، اصلاحی کہانی، لطیفہ یا کچھ اور نظر آیا، انھوں نے سنبھال لیا اور پھر کتابی شکل میں محفوظ کر کے ہندکو زبان کی حفاظت اور پرداخت میں اپنا اہم کردار ادا کیا اور کر رہے ہیں۔

۴۔ ہندکو ضرب الامثال (ہندکو کی کہاوتیں): اس کتاب میں ہندکو زبان کی ضرب الامثال (کہاوتیں) شامل ہیں جو کہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے شائع کی ہے۔ اس میں ایک بڑی تعداد ان کہاوتوں کی شامل ہے جو کہ ہندکو کی عام بول چال میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان کا اردو ترجمے کے ساتھ کتابی شکل میں محفوظ کرنا اس کتاب کی اہمیت اور قدر و منزلت میں خاطر خواہ اضافہ کرتا ہے کیونکہ روزمرہ اور محاورہ، کے ساتھ ساتھ ضرب الامثال کا ہونا اور پھر کسی دوسری زبان میں اس کا لفظی اور اصطلاحی ترجمہ اس زبان کی ترویج و ترقی میں خاصا معاون ثابت ہوتا ہے۔

۵۔ ہندکو اردو لغت (ہندکو زبان کی پہلی لغت اردو ترجمے کے ساتھ) سلطان سکون صاحب کی ادبی زندگی کا سب سے بڑا کام بلکہ کارنامہ میرے خیال میں یہ ڈکشنری ہے جو کہ ان کی تقریباً تیس سال کی محنتِ شاقہ کی علمبردار ہے۔ یہ لغت ہندکو زبان کی پہلی لغت ہے جو کہ ۲۰۰۲ء میں شائع کی گئی تھی مگر بقولِ سکون صاحب، ایک پوری پٹی "پھ" سے شروع ہونے والے الفاظ) کسی وجہ سے اس میں شامل ہونے سے رہ گئی۔ اسی طرح کچھ اور الفاظ بھی سکون صاحب کے ذخیرہ الفاظ ہندکو میں موجود تھے جو کہ اب ایک

ضمیمے کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

۶۔ کوئی خواب ہے نہ خیال ہے (اردو شعری مجموعہ) یہ شعری مجموعہ آپ کا پہلا اردو شعری مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر سکون صاحب کی جوانی کی شاعری ہے جو ان کے تخیل، وجدان، ادراک اور داخلی کیفیات اور معاملات دل کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ سکون صاحب کی غزل کو تو اساتذہ کی سند داد و تحسین حاصل ہے اس خاطر اس کتاب کے حوالے سے زیادہ کچھ کہنا لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

۷۔ تارا لوئی والا (ہندکو مایئے) یہ کتاب ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی، اس میں جناب سکون کی طبع زاد مایئے بھی شامل ہیں اور ہندکو لوک ادب میں موجود مائیوں کو کتابی شکل بھی دی گئی ہے جس سے ہندکو کی سب سے پرانی اور ہر دل عزیز صنف مائیا کی انمول محبت اور حفاظت بھی ظاہر ہوتی ہے اور ہندکو زبان کی ترویج و ترقی کا جذبہ بھی۔ اس کتاب میں سکون صاحب نے حمد، نعت، وطنِ عزیز کے حوالے سے اپنے تخلیق کردہ مایئے شامل کیے ہیں جن کی ایک اچھی خاصی تعداد کتاب میں موجود ہے اور فہرست میں اپنے الگ الگ ناموں سے دکھائے گئے ہیں۔ جبکہ دیگر مواد میں عمومی مایئے، بچلی کے حوالے سے مایئے، دولوں کے حوالے سے مایئے، سکولی مایئے، دوستوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے اور آخر میں طنز و مزاح کی چاشنی سے لبریز مایئے لوک ادب سے ڈھونڈ کر ایک کتابی شکل میں جمع کر کے قارئین کے حوالے کر دیئے ہیں۔

۸۔ دلسوٹھے (ہندکو شعری مجموعہ) یہ کتاب ۲۰۰۸ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ دلسوٹھے ہندکو ادب میں ایک خاص مقام اور پہچان رکھنے والی کتاب ہے، اس کتاب کے شروع سے لیکر آخر تک قاری کو ایک عجیب شعری فضا سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں صرف ایک دو حوالے دینا ضروری سمجھتا ہوں ورنہ تو اس کتاب پر پورا مضمون لکھنا بنتا ہے۔ پہلا حوالہ یہ ہے کہ اس کتاب کی ابتدا ایک ایسی حمد شریف سے ہوتی ہے جو کہ ایک سو تیس (۱۳۰) مصرعوں پر مشتمل ایک طویل نظم کی صورت میں ہے اور ان ۱۳۰ مصرعوں میں اللہ پاک کی شان بیان کرتے ہوئے لفظ "توں" ۱۲۴ بار استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرا ایک بڑا حوالہ یہ ہے کہ اس کتاب میں مختلف شعری اصناف میں عمدہ اشعار اور بہترین دینی، ملی، ثقافتی اور واردات قلبی کے تناظر میں منفرد شعری نمونے موجود ہونے کے ساتھ ساتھ جناب غالب کی دو مشہور غزلوں کا ہندکو منظوم ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب پر انھیں دیگر داد و تحسین اور اعزازات کے علاوہ ہزارہ کی معروف ادبی و ثقافتی ترقی کی تنظیم "ٹوڈبلیوز" کی طرف سے اصلی سونے کا گولڈ میڈل عطا کیا گیا ہے۔

۹۔ کوزے بچ دریا (ہندکو کہاوتیں) جناب سکون کی ایک اور بڑی کاوش "کوزے بچ دریا" ہے۔ یہ کتاب بھی ہندکو کہاوتوں پر مشتمل ہے، اس میں وہ تمام کہاوتیں شامل ہیں جو کی پہلے والی کتاب میں شائع ہونے سے رہ گئی تھیں۔ مثال پبلشرز فیصل آباد نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ موضوع اور مواد کے لحاظ سے ہندکو ادب میں ایک جاندار اور شاہکار کے طور پر مانی جاتی ہے کیونکہ آج کے اس ڈیجیٹل دور میں کسی بھی زبان کے محاورات، اور اقوال زریں، جنھیں کبھی فصاحت و بلاغت کا عنصر گردانا جاتا تھا، اپنی شناخت کھوتے جا رہے ہیں۔ اب صرف یہ کسی کتاب میں ہی دیکھے جا سکتے ہیں اور بوقت ضرورت اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا

سکتا ہے۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس کا ترجمہ سندھی زبان میں "گاگر مینجھ ساگر" کے عنوان سے انجینئر عبدالوہاب ساہتو نے کیا ہے۔

۱۰۔ کوئی ہنستا دکھائی دے (اردو شعری مجموعہ)

جناب سکون کا یہ اردو شعری مجموعہ ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا، جس نے سکون صاحب کے قریبی دوستوں کو بھی ششدر کر کے رکھ دیا کیونکہ انھیں ایک انتہائی سنجیدہ شاعر و ادیب کے نام سے تو سب جانتے ہیں مگر اس مجموعے کے منظرِ عام پر آنے سے شائقینِ شعر و ادب پر سکون صاحب کا ایک نیا حوالہ واضح ہوا کہ ان کے اندر طنز و مزاح کا عنصر اتنی شدت اور لطافت کے ساتھ موجود ہے کہ پڑھنے والے کو اکبر الٰہ آبادی کی یاد آ جاتی ہے۔ اس کتاب میں ان کی ابتدائی شعری کیفیات کا پرتو بھی ملتا ہے اور موجودہ زمانے کے بہت سے رنگ بھی سامنے آتے ہیں۔ مذکورہ مجموعے میں ان کی ۱۹۷۵ء سے ۲۰۱۶ء تک کی کم و بیش چالیس سالہ زندگی کے مشاہدات، واقعات اور تجربات پر مبنی روداد طنز و مزاح کی چاشنی لیے قاری کو نہ صرف دعوتِ فکر دیتی ہے بلکہ چالیس سالہ تاریخ اور معاشرتی رویوں سے بھی آشنا کرتی ہے۔

۱۱۔ کچھ پھول عقیدت کے (چند دوستوں کے لیے اور کچھ دوستوں کا منظوم خراجِ تحسین)۔ کسی شاعر و ادیب کی لیے یہ امر باعثِ تسکین و مسرت ہوتا ہے کہ کوئی مداح اس کے فن اور شخصیت سے متاثر ہو کر اسے منظوم خراجِ تحسین پیش کرے۔ جناب سکون اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب واقع ہوئے ہیں کہ انھیں اپنے متعدد احباب سے ہزاروں مکاتیب اور ان گنت منظوم خراجِ تحسین وقتاً فوقتاً پیش کیے جاتے رہے ہیں اور پھر وہ خود بھی بلا کے مردم شناس ہی نہیں جوہر شناس بھی ہیں۔ انھیں بھی جس کسی شاعر و ادیب میں کوئی متاثر کن بات نظر آتی رہی ہے، اس کا برملا اظہار کرتے رہے ہیں چاہے وہ نثری صورت میں ہو یا منظوم۔ اسی طرح کے کچھ خاص اہمیت کے حامل منظوم و منثور خراجِ داد و تحسین پر مشتمل یہ مجموعہ ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں حمد اور نعت شریف کے بعد جناب سکون نے بابائے قوم، مادرِ ملت، وطنِ عزیز، وادیٔ کشمیر، کے علاوہ وطنِ عزیز کے چند مایہ ناز شعرا اور قائدین کے لیے اپنے جذبات کا اظہار منظوم انداز میں کیا ہے اور جناب واحد سراج کے لیے صنعتِ توشیح میں ایک بھرپور نظم پیش کی ہے۔ اسی طرح جناب احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، قتیل شفائی، افتخار عارف، صوفی عبدالرشید، ڈاکٹر صابر کلوروی، ابرار سالک، حفیظ اثر اور ان جیسی کئی دوسری بلند و بالا ادبی شخصیات کے لیے اپنی نیک خواہشات، دلی جذبات اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ دریں اثنا جن دوستوں نے ان کے لیے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہوا تھا ان کی نثری اور منظوم شذرات کو بھی اس کتاب کا حصہ بنایا ہے۔ اس طور یہ کتاب بھی ایک ادبی تاریخ کی حیثیت سے بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۲۔ کوئی ہے۔ (اردو شعری مجموعہ) یہ کتاب جناب سکون کا دوسرا اردو شعری مجموعہ ہے جو غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں جناب سکون نے اردو غزل کے دو وہ شاہکار پیش کیے ہیں کہ جواب نہیں۔ ان کی غزل میں تغزل اور غنایت کے چرچے تو پہلے مجموعے کے سامنے آتے ہی ہونا شروع ہو چکے تھے مگر اس دوسرے مجموعے کی اشاعت نے اس حقیقت پر مہر بھی ثبت کر دی۔ سہل ممتنع اور حسنِ تغزل سے مملو غزلیات قاری کو ایک منفرد لطف اور حظ مہیا کرتی ہیں۔ اس مجموعے میں کلاسیکی رنگ بھی دیکھا جا سکتا ہے اور

جدید غزل کا حسین انداز بھی۔ سہل پسندی بھی زوروں پر ہے اور قافیہ و ردیف کے حسین سنگم سے اشعار کی لفظی اور کئی کئی معنوی پرتیں بھی کھلتی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ صنائع اور بدائع کے عمدہ نمونے بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

۱۳۔ سوچ رُت (شعری انتخاب) یہ کتاب جناب سلطان سکون اور گل بخشالوی کی مشترکہ تالیفی کاوش ہے جس میں دیس بھر کے ۷۳ شعرا کا نمائندہ کلام غزلیہ آہنگ میں شامل ہے۔ قابل ستائش امر یہ ہے کہ اس کتاب میں شامل کلام کے ساتھ ساتھ متعلقہ شعرا کی رنگین تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ جس سے ان کی شعروادب اور شاعر وادیب کے ساتھ والہانہ محبت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اکادمی ادبیات اسلام آباد نے اپنے ایک خاص سلسلے "پاکستانی ادب کے معمار" میں بھی انہیں خاص اہمیت دی ہے اور ان کی شخصیت اور فن پر جناب قمر رضا شہزاد سے ایک خوبصورت کتاب مرتب کروا کے شائع کر رکھی ہے۔ مذکورہ بالا ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ سکون صاحب نے ایک اور علمی، ادبی تاریخ بھی کچھ اس طرح سے مرتب کر رکھی ہے کہ دیکھنے والوں کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آپ کی ذاتی ڈائریاں، اخباری تراشے اور مختلف اہم شخصیات کے مکاتیب جس سلیقے اور ترتیب سے انھوں نے محفوظ کر رکھے ہیں یہ انھی کا کمال ہے۔

صوفی عبدالرشید، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، نیاز سواتی، شعلہ بجنوری، قتیل شفائی (مرحومین) اور معروف شاعر وادیب اور ماہر علم عروض پروفیسر جناب آصف ثاقب سمیت اسی مقام و مرتبے کے متعدد دیگر ادبی حوالوں کے خطوط، ادبی شذرات کے اخباری تراشے، تصاویر اور خراج تحسین ان کے پاس اسی حالت میں مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں بھیجنے والے نے بھیجیں یا اخبار میں شائع ہوئیں۔ پھر یہ بات بھی قابل تحریر ہے کہ ان کی غزلیات ناصر زیدی کے انتخاب "منتخب غزلیات" میں ۱۹۸۰، ۸۱ اور ۸۲ میں مسلسل شائع ہوتی رہیں اور پھر کشور ناہید، جاوید شاہین اور منو بھائی کے "اردو ادب" میں ۱۹۸۳ء میں بھی شائع ہوئیں جو کہ ایک اعزاز کی بات ہے۔

جناب سکون کی علمی اور ادبی کاوشوں کے اعتراف میں انھیں ان گنت سرکاری و غیر سرکاری اداروں، تنظیموں اور انجمنوں کی جانب سے متعدد ایوارڈ اور اسناد مل چکی ہیں جن میں ایبٹ آباد کی معروف ادبی و ثقافتی ترقی کی تنظیم "فوڈ بلیوز" کی طرف سے دیا جانے والا اصلی سونے کا میڈل اور حکومت پاکستان کی طرف سے عطا کردہ صدارتی ایوارڈ "تمغہ حسن کارکردگی" بہت اہم اعزازات ہیں۔

معروف شاعر وادیب اور ماہر تعلیم جناب واحد سراج نے اپنے تعلیمی ادارے ماڈرن ایج پبلک سکول و کالج ایبٹ آباد کی لائبریری کا ایک حصہ جناب سکون کے علمی و ادبی کارناموں کے نام کر رکھا ہے جس کا نام "گوشۂ سکون" ہے اور اس کا افتتاح بھی جناب سکون کے ہاتھوں چند سال پہلے عمل میں لایا گیا ہے اور ایک اور قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ایبٹ آباد شہر کی ایک سڑک بھی جناب سکون کے نام سے منسوب کی گئی ہے جو کہ ان کی ادبی خدمات کا عمدہ اعتراف ہے۔

اللہ پاک کے حضور التجا ہے کہ وہ ذات والا صفات سلطان سکون صاحب کو عمر دراز اور کامل صحت عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

# شعر وسخن کے سلطان جناب سلطان سکون

سلطان سکون کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں کیونکہ ان کا شمار دورِ حاضر کے چند اکابر شعرا میں ہوتا ہے۔

بہرطور مجھ خاکسار کو ان سے تعلق خاطر کا چار دہائیوں سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ اس لئے مختصراً چند تاثرات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ سلطان سکون پر اظہارِ خیال کے لئے ایک کتاب چاہیے۔ یہ چند سطور تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہیں۔ بہرطور مختصر ہی سہی ان کی شخصیت کے چند پہلو اور علم وادب میں ان کے مقام پر اظہار خیال اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں۔

سلطان سکون گزشتہ چھ دہائیوں سے شعر کہتے ہیں۔ ان کے مقام کا تعین چند بڑے شعرا میں آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

میں نے ان کی درویشانہ طبیعت اور استادانہ لب و لہجہ کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اگرچہ آپ نے نظم، رباعی اور قطعات بھی کہے لیکن بنیادی طور پر آپ غزل گو شاعر ہیں۔ اس لئے میں اپنے خیالات ان کی غزل گوئی پر ہی فوکس کروں گا۔ میر و غالب بھی بنیادی طور پر غزل گو تھے بلکہ عاشق مزاج اور حسن پرست تھے۔ کہا جاتا ہے کہ غزل میں عشق و محبت کے احساسات کا بیان اور عاشقانہ لب ولہجہ بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ انہی مستند اساتذہ کی تقلید میں سلطان سکون کی غزل آرائی اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ سکون صاحب کی غزل میں رنگین لطافت بے مثال ہے اور عاشقانہ لب ولہجہ بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ آپ کے ہاں اداسی اور بے خودی کا رنگ تو یوں چھلکتا ہے کہ ہر درد ان کو اپنا لگتا ہے۔ ان کی غزل میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج موجود ہے۔ خیالات کی سادگی اور سلاست ایسی کہ بات کو پیچیدگی میں کبھی نہیں الجھاتے۔ غزل کو کمال سادگی سے سنوارتے ہیں جس سے ان کے اکثر اشعار سہل ممتنع کی مثالیں بن چکے ہیں۔

معاشرے کے ظلم و کرب کی گہری نشاندہی کرتے ہیں لیکن غزل کی لطافت، رومانیت اور فنی پہلو قائم و دائم رہتے ہیں۔ آپ کی شاعری کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بڑی پزیرائی حاصل ہوئی ہے۔

اس سلسلے میں چند آنکھوں دیکھے مناظر کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔

مظفر آباد میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ملک کے چیدہ چیدہ شعرا شریک تھے اور منصب صدارت پر منیر نیازی تشریف فرما تھے۔ بہت سے بڑے بڑے شاعر اپنا کلام سنا چکے تو اس دوران منیر نیازی صاحب کو مختصر وقت کے لیے مشاعرہ سے اٹھ کر جانا پڑا تو وہ ناظم مشاعرہ سے یہ کہہ کر گئے کہ ''مشاعرہ جاری رکھا جائے لیکن جب تک میں واپس نہ آجاؤں آپ نے سلطان سکون صاحب کی دعوت سخن التوا میں رکھنی ہے تاکہ میں انہیں سننے سے محروم نہ رہ جاؤں۔''

**شاہ نواز سواتی**

سن 1986 کی بات ہے جب اوورسیز تعیناتی کے لیے عارضی طور پر میرا قیام کراچی میں تھا۔ اتفاق سے اسی دوران سلطان سکون صاحب کراچی تشریف لائے۔ جونہی کسی اخبار میں ان کی آمد کی خبر شائع ہوئی تو کراچی والوں نے ان کے اعزاز میں کئی ادبی تقریبات اور مشاعرے منعقد کیے۔ شبنم رومانی چونکہ پہلے سے سلطان سکون کی شاعری اور ادبی حیثیت سے آگاہ تھے لہٰذا وہ سب سے زیادہ متحرک تھے۔ ادبی تنظیموں کے علاوہ شبنم رومانی صاحب نے اپنے دولت خانہ پر بھرپور تقریب کا اہتمام کیا اور دوسری بڑی تقریب مجنوں گورکھپوری صاحب کے ہاں تھی۔ جہاں سلطان سکون مہمان خصوصی کے طور پر مدعو تھے۔

مشاعرہ سے پہلے شبنم رومانی ہمیں کہنے لگے کہ مجنوں صاحب کسی کو داد نہیں دیتے اس لئے درگزر کرنا ہوگا۔ مجنوں صاحب چونکہ کافی ضعیف تھے اور اونچا سنتے تھے اس لئے ہر شاعر اسٹیج پہ جا کر ان کے پاس بیٹھ کے کلام سناتا تھا۔

خیر مشاعرہ جس میں کراچی کے نامی گرامی شعرا موجود تھے، شروع ہوا تو محفل میں حسب معمول شعرا اور سامعین تو داد دے رہے تھے لیکن مجنوں صاحب جو صدارت بھی کر رہے تھے ان کا کسی شعر پر داد دینا دور کی بات سر اٹھا کر دیکھتے بھی نہ تھے۔ مقامی شعرا ان کی طبیعت سے بخوبی واقف تھے۔

آخر میں سلطان سکون کو دعوت کلام دی گئی تو جب انہوں نے اپنی غزل سنانی شروع کی جس کا مطلع تھا:

مری مشکل کا حل کوئی نہیں ہے
ترا نعم البدل کوئی نہیں ہے

---

مجنوں صاحب یکدم متوجہ ہوئے اور قدرے اونچی آواز میں گویا ہوئے۔ مجھے آج بھی ان کے یہ الفاظ یاد ہیں:

''ارے بھائی ان کو (سلطان سکون کو) کہاں چھپا کے رکھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے انہیں کیوں نہ سن پائے''

شبنم رومانی بولے:

''آج مدت بعد مجنوں صاحب سے کسی کو داد ملی ہے''

بس اس کے بعد جو داد ملی وہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ ان سے کئی غزلیں سنی گئیں۔

میری پیروں ملک پوسٹنگ ایک دور دراز جزیرے ماریشیس میں ہوئی جہاں اردو ادب کا بہت چرچا تھا اور تقریبات کا انعقاد ہوتا رہتا تھا۔ 1988 میں پاکستان سے احمد فراز اور فتح محمد ملک صاحبان نے بھی ایک سیمینار میں خصوصی شرکت کی۔ بھارت سے تو ادبی شخصیات اور شعرا کا آنا معمول کی بات تھی لیکن پاکستان کی شرکت کم کم ہوتی تھی۔

ماریشیس کی وزارت تعلیم و ثقافت نے دسمبر 1991 میں ایک سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کا اہتمام کیا جس میں کینیڈا، روس مشرق وسطیٰ، جنوبی افریقہ، یورپ، بھارت اور پاکستان سے وفود نے شرکت کی۔ سب سے بڑی تعداد بھارتی وفد کی تھی جس میں وہاں کے تین چار وزراء اور نامی گرامی شعرا اور ادیبوں کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔

پاکستان سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی قیادت میں سلطان سکون، ڈاکٹر حسن عسکری، ڈاکٹر انور نسیم مدعو تھے۔ ساتھ ہی غزل سنگر حامد علی خان اپنے فن کے مظاہرے کے لیے بھیجے گئے۔ سلطان سکون نے اپنے سیشن میں اردو کی بین الاقوامی حیثیت کے

موضوع پر اپنا بہت عمدہ مضمون پیش کیا جسے حاضرین کی جانب سے بے حد سراہا گیا۔ مشاعروں میں بھی خوب داد سمیٹتے رہے۔ بھارتی وفد کے کئی اراکین نے ان کے بارے اظہار خیال کرتے ہوئے بار بار تعریفی کلمات سے نوازا۔

وہاں سکون صاحب نے پاکستان کا نام روشن کرنے میں یادگار کردار ادا کیا۔ وہاں کے غزل سنگر بلال نے آپ کی ایک غزل پر اپنی آواز کا جادو جگایا جس کی کیسٹ بھی انہیں پیش کی گئی۔

یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ سکون صاحب کے پسندیدہ شعرا میں عبدالحمید عدم، سیف الدین سیف، قتیل شفائی اور احمد فراز شامل ہیں۔

احمد فراز اور احمد ندیم قاسمی خود ان کو بہت پسند کرتے تھے۔

قتیل شفائی اور احمد ندیم قاسمی سمیت سلطان سکون کی شاعری بارے میں کئی مقتدر شعرا کے تبصرے اور پیش لفظ موجود ہیں۔

بقول شبنم رومانی سلطان سکون کا دل غنی ہے اور درویش ان کے اندر بیٹھا ہے۔ یوں سلطان کی کلاہ ان کے سر پر سجتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی فرماتے ہیں جب سلطان سکون سے مجھے غزلیں موصول ہونا شروع ہوئیں تو پہلی غزل سے ہی اندازہ لگا لیا کہ اس شاعر کے لفظوں میں اجالا ہے۔

قتیل شفائی نے لکھا کہ آج ہزارہ کے گلستانِ شعر و ادب میں بہت رنگا رنگی ہے جن میں ایک نمایاں اور دلکش رنگ سلطان سکون کا ہے

احمد فراز جب بھی ایبٹ آباد آتے سلطان سکون سے ان کی ملاقات لازمی ہوتی تھی۔

انھوں نے یہ شعر سکون کی نذر:

برائے نام بھی ہم کو سکون کیا ہو جہاں
سکون نام کا اک شخص اضطراب میں ہے

.....

ان کے سب سے قریبی دوست نامور شاعر آصف ثاقب کہتے ہیں۔ کوئی بھی سخن فہم سلطان سکون کے شاعرانہ سحر سے نہیں نکل سکتا۔ جہاں اور رنگ ہیں وہاں میر کی سی دردمندی بھی چٹکیاں لیتی ہے۔

معروف ادبی شخصیت صوفی عبدالرشید کے مطابق۔ جیسی بیت صنع اور بے لوث شخصیت ویسی ہی شاعری بھی ہے۔ معصومیت، سادگی اور اخلاص سکون صاحب کی شخصیت میں نمایاں ہیں۔

سلطان سکون صاحب کی ایک ادا یہ بھی ہے کہ وہ بذریعہ خط رابطے کو ٹیلی فون پر ترجیح دیتے ہیں۔ دوستوں کے نام ان کے خطوط ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔

بقول محسن احسان سکون کلاسیکی اور جدید غزل کی فنی ساخت کے رنگ و آہنگ کو معتبر رکھے ہوئے ہے۔

سکون صاحب کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں تین اردو غزل مجموعوں کے علاوہ ہندکو اور اردو لغت، ہندکو ضرب الامثال ہندکو شعری مجموعہ اور ہندکو کہاوتوں، پہیلیوں، محاوروں اور لوک کہانیوں پر مشتمل کتب شامل ہیں۔ ادبی خدمات پر تین اعزازات پانچ گولڈ میڈل حاصل کر چکے ہیں۔

علاوہ ازیں اعترافِ فن کے حوالے سے ان پر تین مقالہ جات لکھے گئے جن میں دو پشاور یونیورسٹی کی جانب سے ہیں اور ایک گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ایبٹ آباد کی طرف سے ہے۔

سلطان سکون صاحب کے غزل مجموعہ سے انتخاب بطور "مشتے نمونہ از خروارے۔"

احمد فراز کے مشہور شعر کے جواب میں یہ دلچسپ شعر سلطان سکون کی ایک غزل سے۔

فراز کا شعر:

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

سلطان سکون کا شعر:

ہم وہ خوش فہم کہ اب بھی یہ سمجھتے ہیں سکون
دوست ہوتا ہے ہر اک ہاتھ ملانے والا

نہیں کہ رہتے ہیں اپنے ہی دکھ پہ افسردہ
ہمیں تو اوروں کے دکھ بھی نڈھال رکھتے ہیں

سبھی کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنا
ہمیں حاصل یہی ترجیحیں ہیں

درخت کٹتے گئے اور مکان بنتے گئے
ہمارے سر پہ کئی آسمان بنتے گئے

وہ لمحے خواب ہوئے وہ سخن سراب ہوئے
نگاہیں برف ہوئیں دل چٹان بنتے گئے

وہ عمر بھر کی رفاقت کا اتنا پھل دے گا
دکھوں پہ صبر کی تلقین کر کے چل دے گا

پلٹ کے آ گیا بچے کو خالی ہاتھ لئے
سجی دکانوں پہ چیزوں کو دیکھتا رکھتا

روگ کچھ آپ بھی ہم دل کو لگانے لگ جائیں
جو ملے ہنس کے اسے دل میں بسانے لگ جائیں

کوئی رسماً ہی اگر پرسشِ احوال کرے
ہم وہ خوش فہم اسے تفصیل بتانے لگ جائیں

نہ غمگسار نہ پرسانِ حال رکھتے ہیں
ہم اپنے دل ہی میں اپنا ملال رکھتے ہیں

مسائل اس قدر درپیش ہیں، اب زندگی نے
ہمیں تقسیم کر کے جابجا رکھا ہوا ہے

کسی پہلو سے خود منصف بھی ہے اس میں ملوث
جو اب تک التوا میں فیصلہ رکھا ہوا ہے

تجھے یہ حق ہے شجر پر ہو جو ثمر لے جا
مگر نہ اتنا کہ شاخیں بھی توڑ کر لے جا

اگر چلا ہے کہیں حرفِ حق سنانے کو
تو ایسا کر کہ ہتھیلی پہ رکھ کے سر لے جا

بہت مٹھاس جو اپنی زباں میں رکھتا ہے
وہ ایک تیر ستم بھی کماں میں رکھتا ہے

ہم ہی نہ تھے اداس، پریشان وہ بھی تھا
شاید بچھڑ کے ہم سے، پشیمان وہ بھی تھا

جب وہ تنہا کبھی ہوا ہو گا
یاد شاید مجھے کیا ہو گا

آہ بھر کر ہوں مطمئن ایسے
جیسے اس نے بھی سن لیا ہو گا

سکون اس کا وہ رسماً ہی مسکرا دینا
غمِ حیات کی ساری تھکن اتار گیا

کوئی خواب ہے نہ خیال ہے یہ ملال ہے
کوئی ہجر ہے نہ وصال ہے یہ ملال ہے

نہ وہ آسکیں نہ سکون ہم وہاں جا سکیں وہی
حسرت پہ وبال ہے یہ ملال ہے

☆☆☆☆☆

# وادی سربن کا درویش......سلطان سکون

شہر سبز وگل (ایبٹ آباد) کے کوہ سربن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ شاعر مشرق نے اس کو اپنی نظم کا موضوع بنایا اور ''ابر'' جیسی خوبصورت نظم تخلیق کی جوان کے مجموعے ''بانگ درا'' کا حصہ ہے۔

اسی کوہ سربن کے دامن میں ایک ''کہیال'' نامی بستی ہے۔ گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج اور سول ہسپتال ایبٹ آباد کے درمیاں ایک ذیلی سڑک دائیں ہاتھ کو مڑ جاتی ہے۔ اس سڑک پر چند برس پہلے ایک سادہ پُروقار تقریب کے دوران ''سلطان سکون روڈ'' کی تختی نصب کی گئی۔ شہری دفاع کی تنظیم کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی اس تقریب کی مہمان خصوصی اس وقت کی ڈپٹی کمشنر ایبٹ آباد عمارہ خٹک تھیں اور صاحب شام سلطان سکون تھے ۔ تقریب کے دوران زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے مقررین نے سلطان سکون کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا اور یوں یہ سڑک ''سلطان سکون روڈ'' بن گئی۔ اس سڑک پر کوئی ایک ڈیڑھ فرلانگ اوپر کی طرف جائیں تو اردو اور ہندکو کے بزرگ ادیب سلطان سکون کے مسکن ''گوشہ سکون'' کے سامنے پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں یہ درویش صفت انسان گزشتہ چھ دہائیوں سے اپنی دھن اردو اور ہندکو ادب کی اقلیم میں اضافے کرنے میں مصروف ہے۔

ہم نے ہوش سنبھالتے ہی ہزارہ کے جن شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ تواتر کے ساتھ سنا اور جن کے نام اکثر اخبارات ورسائل کی زینت بنتے رہے ان میں نیاز سواتی، صوفی عبدالرشید، آصف ثاقب، ارشاد شاکر اعوان، ایوب صابر، صابر گلوروی، سید واجد رضوی، ریاض ساغر اور سلطان سکون کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر ادیبوں و شاعروں کا تعلق شعبہ تعلیم سے تھا۔ سوائے نیاز سواتی اور سلطان سکون کے۔

سلطان سکون شعبۂ تعلیم میں بطور اکاؤنٹ کلرک بھرتی ہوئے اور پھر اسی شعبے سے بطور (اے ایس ڈی او) سبکدوش ہوئے۔ اکاؤنٹ کے شعبے میں رہتے ہوئے لوگوں نے کئی کئی شاندار گھر بنائے، پلاٹ خریدے اولادوں کو اعلیٰ تعلیمی اداروں سے تعلیم دلوائی، اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کی لیکن سلطان سکون نے اس شعبے میں رہ کر بھی اپنی ساری زندگی سفید پوشی میں بسر کی۔ عمر بھر کرائے کے مکان میں رہے۔ بچوں کو اپنی استطاعت کے مطابق تعلیم دلوائی اور ہمیشہ

قمر زمان

لقمۂ حلال کو ترجیح دی اور اپنی اولاد کو بھی اسی روایت کی تعلیم دی کہ رزق حلال سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ سلطان سکون سے میری ملاقات چند برس پہلے بزم علم وفن ہزارہ کی کسی تقریب میں ہوئی۔ اس سے پہلے غم روزگار نے شہر سبزہ وگل میں قیام کرنے ہی نہ دیا کہ ان بزرگوں کی محفلوں میں بیٹھتے۔ اس پہلی ملاقات میں ہی ان کی موثر شخصیت نے دل موہ لیا۔ ان سے کافی دیر بات چیت ہوئی حالانکہ ان سے پہلے تعارف بھی نہ تھا۔ پھر ان سے اکثر مشاعروں اور ادبی تقریبات میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ پھر یہ سلسلہ دراز ہوا اور گوشۂ سکون پہ بھی حاضری کا موقع ملتا رہا اور تاحال یہ سلسلہ جاری ہے۔ سلطان سکون زندگی کی اٹھاسی بہاریں دیکھ چکے ہیں لیکن آج بھی ان کی گفتگو میں وہی تازگی ہے جو برسوں پہلے تھی۔ یوں تو ان سے زندگی کے سب ہی موضوعات پر گفتگو رہتی ہے لیکن شعر و ادب ان کا من پسند موضوع ہے کیونکہ ان کی ساری زندگی اسی اقلیم میں بسر ہوئی ہے۔

آپ ان سے عدم کی غزلوں پر بات کریں یا قتیل شفائی کے گیتوں اور شاعری کا فراز کے تغزل کو موضوع بنائیں یا احمد ندیم قاسمی کے ''فنون'' پر گفتگو کریں۔ ہزارہ میں برپا ہونے والے مشاعروں اور ادبی تقریبات کے حوالے سے ان کی یادوں کو کریدیں ''ایور گرین کیفے'' میں دوستوں کے ہمراہ گزری ہوئی شاموں کا تذکرہ چھیڑ دیں پھر دیکھیں ان کی یادوں کے در کیسے وا ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو بہتے چشمے کی مانند رواں ہو جائے گی۔ اس دوران کبھی تو معصوم بچوں کی طرح کھلکھلاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ عدم کی عشقیہ شاعری پر بات کرتے ہوئے یہ کہیں گے کہ ''عدم نہ ہوتا تو شاید میں شاعر ہی نہ ہوتا'' اور اپنے اسلاف اور بزرگوں کے ذکر پر ان کی آنکھیں نم ہو جائیں گی۔ اپنے والدین کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، قتیل، شفائی، احمد فراز اور کچھ دیر مشاہیر کے تذکرے پر ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور سلطان سکون انھیں دعائیں دیتے نظر آئیں گے۔ اس کے علاوہ ہم نے ان کی محفل میں کئی ایسے شعرا کا تذکرہ سنا ہے کہ جو کبھی ہزارہ کی ادبی فضا کا معتبر حوالے تھے لیکن پھر زمانے کی گرد میں کہیں گم ہو گئے۔ ان میں بطور خاص میکی میرٹھی، عبداللہ یزدانی، حاکم علی حاکم، شاہنواز سواتی، سلطان سکون کو اللہ پاک نے محبت کرنے والے دل سے نوازا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''گوشۂ سکون'' ایک عرصہ تک شعر و ادب کا مرکز بنا رہا اور یہاں ادبی محفلوں کا انعقاد ہوتا رہا۔ ''گوشۂ سکون'' کو ایک طرف قتیل شفائی جیسے عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادب کی میزبانی کا شرف حاصل ہے وہ دوسری طرف مجھ ایسا ایک عام طالب علم بھی سہولت سے وہاں جا سکتا ہے اور یہ بات سلطان سکون کی کشادہ دلی کی مظہر ہے۔ ان کے ہاں شاعر، ادب، محقق، پروفیسر صاحبان اور عام طالب علم اپنی

اپنی ضروریات کے مطابق حاضر ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو خود ان کی گفتگو میں ہزارہ کی گزشتہ چھ دہائیوں کی ادبی تاریخ کے حوالے ملتے ہیں اور دوسری طرف انھوں نے ہزارہ کے شعروادب کے سرمائے کو بڑے سلیقے سے سنبھال رکھا ہے۔ سکون صاحب کے پاس آپ کو بہت ساری فائلوں میں ادبی تراشے، خطوط وتصاویر ملیں گے۔

یہ ''جمہور'' کی فائل ہے تو دوسری ''نشیمن'' کی۔ ایک فائل دوستوں کے اخبارات میں شائع ہونے والے کلام کی ہے تو دوسری ادبی تقریبات کی رودادوں کی، کسی فائل میں تاثراتی مضامین ملیں گے تو کسی دوسری میں وہ دعوت نامے نظر آئیں گے جو مختلف ادبی تنظیموں کی طرف سے انھیں موصول ہوتے رہے۔

ایک فائل ہندکو اردو لغت کے اخباری تراشوں کی ہے تو ایک دنیا میں رونما ہونے والے عجیب وغریب واقعات کی اور ایسی ہی کسی فائل سے دوستوں کی پرانی تصاویر برآمد ہوں گی۔ تاہم خطوط کی فائلیں اس کے علاوہ ہیں۔ خطوط جن کی تعداد ہزاروں میں ہے وہ آج بھی اپنے ہاتھوں سے خطوط لکھتے ہیں۔ ملک بھر کے ادبی رسائل میں آپ کو سلطان سکون اور آصف ثاقب کے خطوط نظر آئیں گے اور یہ دونوں ادیب گزشتہ چار دہائیوں سے خطوں ہی کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ رکھے ہوئے ہیں اور بلاناغہ ایک دوسرے کو خط لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سلطان سکون کے پاس اہل ادب کے خطوط بھی بڑی تعداد میں ہیں جو ان کے نام لکھے گئے جن میں کئی خطوط پاکستان بھر سے شائع ہونے والے خطوط کے مجموعوں کی زینت بھی بن چکے ہیں۔ خطوط کا ذکر ہوا ہے تو ایک اور قصہ بھی سکون صاحب کے حوالے سے ان کے احباب میں بڑا مشہور ہے۔

وہ یوں ہے کہ عمر کی چھٹی دہائی یعنی کوئی ساٹھ برس کی عمر میں ایک عشقِ بلاخیز نے سکون صاحب کو آگھیرا.....

موصوفہ سے راز و نیاز کی سب باتیں بذریعہ خطوط ہوتی رہیں کہ اس زمانے میں جدید ذرائع ابلاغ کا ابھی زیادہ چلن نہیں تھا اور خطوط ہی کے ذریعے حال دل بھیجا جاتا تھا۔ یوں طویل خطوط کا ایک اچھا خاصا مجموعہ جمع ہو گیا۔ اس مجموعے کو سلطان سکون نے اپنے ایک عزیز کے پاس مظفر آباد بطور امانت رکھوا دیا۔ اس دوران 2005 کا قیامت خیز زلزلہ آیا، دنیا تہس نہس ہو گئی لیکن سلطان سکون کی محبت کی یہ نشانی ''خطوط کا یہ مجموعہ محفوظ رہا۔ بعدازاں کسی کمزور لمحے میں سلطان سکون نے یہ خطوط نذر آتش کر دیے، جس پر افسوس کا اظہار وہ اب بھی کرتے ہیں۔

تاہم سکون صاحب کے ایک مہربان شاعر، ادیب وصحافی جبار مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ ''یہ محبت کی نشانی تھی اس لیے زلزلہ میں بھی محفوظ رہی۔ لیکن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ سکون صاحب نے وہ خطوط جلا دیے ہیں بلکہ یقیناً اب بھی کسی کے پاس امانتاً رکھے ہوں گے۔''

خیر یہ تو جبار مرزا صاحب کی ان سے محبت

ہے قصہ یہ ہے کہ وہ مجموعہ اب نہیں رہا۔ سلطان سکون نے برسوں سے یہ ادبی سرمایہ اور یہ خطوط سنبھال کے رکھے ہوئے ہیں اور اس کی کوئی دوسری مثال ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔

سلطان سکون بچپن سے ہی بہت خوش گلو ہیں اور اکثر رشتہ داروں کی شادیوں میں ان سے ''ماہیے'' سننے کی فرمائش کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ایک ہم جماعت غلام سرور کے ساتھ کورس کی نظمیں ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ آگے چل کر یہی ترنم مشاعروں میں ان کی پہچان بنا اور اب بھی مشاعروں میں ان سے ترنم میں کلام سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ ہم نے کئی مشاعروں میں ان سے مترنم کلام سنا ہے۔

یوں تو ان کے لڑکپن کی کسی تصویر میں، میں نے ان کے سر پر ٹیڑھی ٹوپی بھی دیکھی ہے لیکن خدا لگتی کہوں تو اتنے برسوں میں ان کی شخصیت میں اس ''کج کلاہی'' کا شائبہ نہیں دیکھا۔ بلکہ ان کی شخصیت مشرقی شرافت کا عملی نمونہ ہے۔ جس میں چھوٹے بڑے کی تمیز شرم وحیا اور رواداری جیسی صفات پائی جاتی ہیں۔ وہ آج بھی مشرقی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ انھیں اپنا گاؤں، اپنی مٹی، وہاں کی روایات اور وہاں کے لوگوں سے بے پناہ محبت ہے، ان کی سادہ لوحی اس پر دال ہے۔

سلطان سکون ان لوگوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں جو دولت و امارت کے آ جانے سے اپنے ماضی کو فراموش کر دیتے ہیں اور مادیت پرستی کی وجہ سے جن کے خون سفید ہو چکے ہیں وہ ایسے لوگوں میں کبھی بھی خوش نہیں رہتے۔ وہ جدید ٹیکنالوجی اور اس کے استعمال کے خلاف نہیں ہیں لیکن ان کے خیال میں اس نے انسانوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔ اس لیے وہ آج بھی سادگی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سلطان سکون ایک خوددار انسان ہیں وہ کسی کے احسان تلے دبنا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔ اپنے مہمانوں کی قدر کرتے ہیں۔ انھیں اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جس کو میں اکثر ''پرائیڈ آف پرفارمنس چائے'' کہتا ہوں تو وہ بڑے محظوظ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مہمانوں کے نام اپنے روزنامچے میں درج کرتے ہیں اور کئی برسوں سے ان کا یہی معمول ہے بلکہ یہی نہیں وہ اپنے مہمانوں کے لیے فارغ وقت نوافل پڑھ کر دعائیں بھی کرتے ہیں۔

سلطان سکون بلا کے حسن پرست ہیں ان کی زندگی میں بھی اس بات کی بڑی اہمیت اور ان کے معمولات حسن ترتیب نظر آتا ہے۔ ابھی تو گھٹنوں کی تکالیف میں مبتلا ہیں ورنہ وہ اپنے گھر کے سامنے بہنے والی نالی کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے تھے کہ گندگی ان سے برداشت نہیں ہوتی وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو صاف

ستھرا رکھتے ہیں اور یہی نفاست پسندی ان کی شخصیت کا ایک اہم حصہ ہے - ان کی شخصیت کی ہر دلعزیزی میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔

ملک بھر کے اہلِ ادب ان کی قدر کرتے ہیں۔ پشاور میں ڈاکٹر نذیر تبسم سے بات ہو تو وہ سلطان سکون کا پوچھتے ہیں۔ کراچی میں معراج جامی سے بات کروں تو وہ انہی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اسلام آباد میں جبار مرزا صاحب سے ملنا ہو تو وہ سکون صاحب کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ مظفر آباد کے غازی علم الدین ہوں یا کھاریاں کے گل بخشالوی سب سلطان سکون سے محبت کا اظہار کرتے ہیں اور سلطان سکون بھی احباب سے مسلسل رابطے میں رہتے ہیں۔

سلطان سکون کو سرکاری و غیر سرکاری سطح پر بہت سے اعزازات سے نوازا گیا۔ ملک کا سب سے بڑا اعزاز ''تمغہ حسنِ کارکردگی'' ملا۔ ان کے نام سے ایک سڑک منسوب کر دی گئی۔ ان کی شخصیت اور فن پر مقالات لکھے گئے لیکن اس سب کے باوجود ان کی

جناب محمد عاصم بٹ اور جناب سلطان سکون۔

خوئے درویشی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی نہ تو انھوں نے اپنے ماضی کو بھلایا، نہ لوگوں کے ساتھ رویے میں تبدیلی آئی بلکہ لوگوں کی تواضع میں وہ پہلے بڑھ کر حصہ ڈالنے لگے۔

سلطان سکون ہزارہ کی گزشتہ چھ سات دہائیوں کی ادبی و سماجی تاریخ کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان سے اکثر ملاقات پر ہمارا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی یادداشتیں یا اپنی آپ بیتی لکھیں تاکہ یہ ادبی و سماجی تاریخ محفوظ ہو سکے کیونکہ قیام پاکستان کے فوراً بعد انھوں نے ادبی حلقوں میں جانا شروع کر دیا تھا اور ہزارہ کی کئی ادبی تنظیموں کا قیام ان کے سامنے عمل میں آیا اور کچھ تنظیموں کے تو بانی ارکان میں سلطان سکون کا شمار ہوا ہے اس لیے اس تحریر مکرران سے مطالبہ ہے کہ اپنی آپ بیتی ضرور لکھیں تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے ہزارہ کی ادبی و سماجی تاریخ محفوظ ہو سکے ویسے ہی جیسے ان کے مربی قتیل شفائی نے اپنی یادداشتوں میں محفوظ کی ہے۔

☆☆☆☆☆

جناب سلطان سکون اور جناب پروفیسر ڈاکٹر طارق عزیز۔

# سلطان سکون: میرے عہد کا خدائے سخن

ابن رشیق نے اپنی کتاب 'العمدۃ فی صناعۃ الشعر ونقدہ' جس شاعری کے خدوخال واضح کیے ہیں وہ آج بھی اپنے فکری اور فنی تازگی کے سبب من وعن تسلیم کیے جا رہے ہیں۔ ان افکار کی روشنی ہی میں متاخرین وناقدین اور شعرا نے اپنے اپنے مسالک ترتیب دیے ہیں۔ ان افکار کا عکس اگر آج کسی شاعر کے ہاں دیکھنا مقصود ہو تو سلطان سکون کی کتاب ''کوئی ہے'' آپ کی منتظر ہے۔ جہاں سلطان سکون کی شاعری اپنے حسن و تاثیر کی داد خواہ ہے۔۔۔ کتاب کے انتساب ''اس کے نام'' سے لے کر نظم ''ہوائے شہر جاناں'' تک کا سفر ایک نہایت خوشگوار شعری فضا اور بہترین اشعار میں جذبات نگاری، زندگی کی بے ثباتی، وسیع المشربی، غیرت مندی، عشق مجازی، ستم ہائے زمانہ، غم روزگار اور دیگر غزل کے روایتی مضامین کے علاوہ عہدِ حاضر کے واویلے، انسان دوستی، زندگی کے معاملات میں تحمل اور بردباری کے ساتھ ان کے اپنے فقیرانہ منش کی جھلک نے شاعری کو سحر آفریں بنا دیا ہے اور شاعر کو میرے عہد کا خدائے سخن بنا دیا ہے۔

یہ دیکھنا ہوگا کہ سکون نے شاعری کو کس حوالے سے لیا اور کیا یہ خدائے سخن اپنی شاعری میں جلوہ فگن ہے یا یہ کوئی خلوت نشین شاہ ہے، اس کی کروفر، اس کے عجز اور اس کے فن کو اس کی شاعری میں تلاش کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان کی شاعری نے کیسے اردو کلاسیکی شاعری کی روایت کو برتا ہے کہ شاعر کا تازہ لہجہ اور منفرد اسلوب نے کیونکر اردو شاعری میں ایک تازہ طرز کو جنم دیا ہے۔ سلطان سکون کا تعلق شاعروں کی اس پود سے ہے جنھوں نے ایبٹ آباد میں اردو زبان وادب کی تخم ریزی کی ہے۔ ایبٹ آباد میں گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کے بننے اور پھر پی ایم اے کے قیام نے نہایت زیریں سطح پر سہی لیکن ایک ادبی تحرک کو جنم دیا تھا جس کو خوش قسمتی سے اس عہد کے

**عادل سعید قریشی**

چند قد آور شخصیات نے سینچا اور یوں دبستان ایبٹ آباد کی پڑی۔ شاعری اس دبستان کی سب سے بڑی دین ہے اور ایک طویل تر فہرست شعرا ترتیب دی جا سکتی ہے جو آنے والے وقتوں میں بڑھتی ہی چلی گئی۔ اسی فہرست کے چند معتبر اور محترم ناموں میں سے ایک نام سلطان سکون کا بھی ہے۔

میری پہلی ملاقات ان سے ۱۹۹۵ء میں گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج نمبر ۱ ایبٹ آباد میں ہوئی تھی جہاں میں ایم اے اردو میں پڑھا کرتا تھا۔ شعبہ میں کوئی بھی تقریب ہوتی سلطان سکون صاحب جلوہ فرما ہوتے۔ اس وقت معلوم پڑا کہ صوفی عبدالرشید صاحب کے قریبی دوست ہیں۔ سادہ اور خوش لباس سلطان صاحب ہلکا سا تبسم لیے دکھائے دیتے تھے۔ جب سلام دعا بڑھی تو معلوم ہوا کہ یہ سلطان تو ایک درویش ہے:

زیست کرتا ہوں بسر یوں تو فقیرانہ سکون
ایک دن کا کبھی سلطان بھی ہو جاتا ہوں

.....

پھر چند مشاعروں میں سننا نصیب ہوا تو اس سلطنتِ شعر کے سلطان کی شاعری نے اپنی رنگا رنگی سے متاثر کیا اور الگ لہجے اور طرز شعر نے اس درویش کے مسلک شعر کا پتا دیا جہاں انسان اپنی انسانیت کے سبب عظیم بھی ہے اور قابل تعظیم بھی، جہاں دکھوں کو سہنا ایک خالص انسانی شرف ہے جو کسی بھی اور جنس کو ودیعت نہیں ہوا، جہاں وفا کی تلاش زندگی کو واحد وظیفہ نہیں جیسے زندگی صرف عشق میں گزارنے کے لیے نہیں ملتی بلکہ عشق سے اور بھی کئی ضروری کام انجام دینا ہوتے ہیں۔ گو عشق کی چبھن اور خلش قلبِ شاعر میں ہر گھڑی میں کھٹکتی بھی اور شعروں میں ڈھلتی بھی جاتی ہے:

فائدہ کیا ہے کسی کو بھی بتانے کا سکون
جو بھی دکھ ہے اسے دل ہی میں چھپایا ہوا ہے

ڈھلتے گئے ہیں وہ مرے شعروں کے روپ میں
وہ دکھ جو یاد آپ کے منہ پر نہ آئے تھے

.....

اسی طرح موضوع کا تنوع ایسا ہے کوئی بھی بات ایسی نہیں جو زندگی کے کسی بھی زاویے سے متعلق ہو اور ان کے تجربے میں آئی ہو اور انھوں نے سلیقے سے شعر میں نہ باندھ دی ہو۔ عشق ہو کہ بے وفائی، مطلب براری ہو کہ فکر روزگار، بیٹے کے پردیس میں جوانی تجنے کا احساس ہو کہ ماں بنا گزرتی راتیں، دل کی لگن کا بیان ہو کہ محبوب کی پردہ داری، غرض ہر موضوع کی لَو کو نہایت معروضیت سے برتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

پلٹ کے آ گیا بچے کو خالی ہاتھ لیے
سجی دکانوں پہ چیزوں کو دیکھتا، رکھتا

ماں جو نہیں تو اپنے دکھوں پر اب اکثر میں
اپنے ہی زانو پر سر رکھ کر رو لیتا ہوں

کوئی رسماً ہی اگر پرسشِ احوال کرے
ہم وہ خوش فہم اسے تفصیل بتانے لگ جائیں

..........................................

قاری کو ان کی شاعری میں ندرت فکر اور رفعت خیال کو ڈھونڈنے کی سعی کرنی نہیں پڑتی ہے بلکہ یہ دونوں وصف ہر مصرعے اور شعر میں جھلکتے ملتے ہیں۔ سلطان سکون کی ریاضت شعر ان کی کتاب کے ہر ہر صفحے پر پھیلی ہے۔ ان کا عشق بھی ایک سنجیدہ تجربہ ہے جس کی کہانی ان کے کی اشعار میں بکھری پڑی ہے اور اگر ان سب اشعار کو یک جا کر لیا جائے تو وہ مکمل کہانی قاری کے سامنے آ جائے لیکن یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ وہ اپنے محبوب کے عشق میں کسی قنوطیت اور پچھتاوے کا شکار نہیں بلکہ کہیں محبوب کی یاد کا ذکر ہے تو کہیں اس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کا بیان، کہیں اس کی بے وفائی مذکور ہے اور کہیں اپنی محبت کی شدت کھل رہی ہے، کہیں اس کے ساتھ سوچے کل کے قصے ہیں تو کہیں اس کی ذات سے جڑی باتوں کو سوچ کر اپنی ذات میں ہی انجمن بن جانے کا راز افشا ہے۔

سکون اپنا جنوں بھی ہے زیادہ
وہ صورت بھی مگر پیاری بہت ہے

بچھڑ کر اس سے وہ ویراں کدہ ہے دل میرا
نہ چاپ نہ دستک نہ اب صدا ہے کوئی

قیامت ہے وہ اس کی سادگی بھی
بہت بنتا سنورتا بھی نہیں وہ

ہاں ان کے شعر میں ایک گونہ سادہ بیانی اور شستگی سکون کو باقی سب شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ

اب تو وہ دھیان میں بھی میرے
بے خد و خال ہو چکا ہے

..........................................

اور انتساب اسی بے خدوخال کے نام ہے۔ سچ ہی ہے کہ عشق ایک تجربہ ہی نہیں بلکہ عشق ایک سودا ہے جو سما جائے تو پھر سما جاتا ہے۔ لاکھ کہیے نہیں ہے مگر وہ کبھی لفظوں کے چناؤ میں دکھائی دے جائے گا تو کبھی ترکیبوں میں جھلک جائے گا، تو کبھی کسی تشبیہ میں ظاہر ہو جائے گا اور استعارہ تو ہے ہی عشق کا ازلی دشمن کہ وہ اس کو عیاں کیے جاتا ہے۔ لاکھ صناعی کیجیے لاکھ رمز برتیے، بھلے بات بدلیے، عشق کی لو ہے کہ تیرگی کو چیرتی نکل جائے گی۔ سلطان سکون کی محبت کوئی راز کی بات نہیں، وہ اپنے اس عشق پر فخر کرتے ہیں:

ہمیں کچھ ایسے محبت نے دربدر کیا ہے
کہیں پہ کوئی ٹھکانہ کیا نہ گھر کیا ہے

میری دیوانگی پہ طنز کرتے ہو مگر
اس کو دیکھو گے تو میرے ہم نوا ہو جاؤ گے

..........................................

عشق سلطان کی داستان کچھ بھی ہو محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو رابطے ہوں نہ ہوں اس کی لگن بڑھتی جاتی ہے اور سکون کی شاعری اپنے سکوت کے اندر ایک ایسا شور رکھتی ہے جو اس کے پڑھنے والے کو اس کی محبت کی کہانی سننے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

محبت کی کہانی ایک نظر سے شروع ہو کر روح کی اسیری تک جا پہنچتی ہے۔ شاعر فرماتے ہیں:

کوئی دکھائے تو دو چار دن گزار کے یوں
کہ ہم نے عمر کو جس طور سے بسر کیا ہے

اس نے یوں میرے دل وجاں میں سرایت کی ہے
اب کسی طور بھی میں اس کو بھلانے کا نہیں

..............................

عشق سلطان خالصتاً انسانی عشق ہے، ان کی شاعری میں ان کا محبوب اٹھتا بیٹھتا، چلتا پھرتا، روٹھتا منتا دکھائی دیتا ہے، وہ محبوب اسی ہماری زمین کا ہے، اسی کنج و خیال کا ہے اسی شیروان وتناول کا ہے اسی رُش اور پکھل کا ہے۔ سکون کے شعر میں اس کی تصویر کسی دیومالائی پیکر کی نہیں ہے، شاعر ہمیں نہیں بتاتا کہ اس کا محبوب اس کو کیسے چائے پلاتا تھا، ناز کیسے دکھاتا تھا، نظریں کیسے چراتا تھا، کہاں ایک دوسرے کو کیسے دیکھا ہے گو یہی یادیں اس شاعر محبت کا اثاثہ ہیں لیکن شاعر لمحہ حاضر بیان کرتا ہے، شاعر معاملات عشق پر بات نہیں کرتے بلکہ صرف اپنے دل کا حال دیتے ہیں اور وہ بھی لمحہ حاضر کا کہ جب ان کا عشق سماج گزیدگی سہہ چکا ہے:

لے تو پہنچے تھے اسے یاد کی سرحد سے پرے
دل خودسر نے مگر ہم سے بغاوت کر دی

سکون آج کے اس دور اضطراب میں بھی
ہمارے دل ہی میں جائے امان باقی ہے

رہا سماج تو حائل دلوں کے بیچ اکثر
مگر تمہارے میرے درمیاں زیادہ ہوا

اسی طرح شعر سکون میں ماضی میں محبوب کے ساتھ گزرے ہوئے وقت مذکور نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے عشق کو دل میں بسا لیا اور اس عشق کو متاع بے بہا جانا۔ کہیں وہ رسماً اپنے ماضی کا ذکر کر بھی لیں لیکن ان کو اپنے عشق کا موجود لمحے کا احساس زیادہ ہے۔ کہتے ہیں:

میرے دل کی منڈیر پر تو اب بھی
تری یادوں کا کاگا بولتا ہے

چلوں تنہا تو مجھ سے چپکے چپکے
تیرے لہجے میں رستا بولتا ہے

خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کے یہ کہہ دے
کہ ہم نے تجھ سے محبت میں انتہا نہیں کی

فقط جذبات کی رو میں وہ خط لکھے نہیں تھے
ابھی بھی قائم ہوں ہر خط کی ہر تحریر پر میں

..............................

شعر سکون میں، یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی ہے کہ شعر سکون کے بہت سے اوصاف اپنی جگہ سہی لیکن عشق سلطان ہی ان کی شاعری کی سب سے نمایاں خوبی ہے۔ وہ شاعر عشق اپنے محبوب کے ساتھ ایک فاصلاتی تعلق میں ہے اور وہ اپنے حال سے بے پروا ہے نہ بے خبر وہ جانتا ہے ماضی کتنا ہی حسین اور نازک جذبوں کا مالک کیوں نہ ہو اصل کہانی حال ہی ہے۔ تبھی تو کہتے ہیں شاعری نے ان کو سنبھال لیا:

مجھے کہیں کا نہ رکھتا غم حیات سکون
اگر میں شعر و سخن سے نہ دل لگا لیتا

سکون شعر و سخن کیوں نہ ہو عزیز ہمیں
کہ عمر بھر میں بہم اک یہی خزانہ کیا

.....

عشق کی ساری سحر خیزیاں اپنی جگہ سہی لیکن جو رشتہ شریک حیات نبھاتی ہے اور ساری زندگی تج دیتی ہے اس بات سے انکار کیجیے تو کیسے کیجیے اسی لیے ، سلطان سکون اپنی شریک حیات کو بھی خراج پیش کر دیا:

خادمہ بھی ہے اہل خانہ کی
نظم خانہ کی کاروار بھی ہے

صنف نازک ضرور ہے لیکن
عزم و ہمت کا کوہسار بھی ہے

یہ ہے گھر کا سکون ، جانِ سکون
لطف بھی ، چین بھی ، قرار بھی ہے

.....

غرض عشق سلطان در شعر سکون کے باب میں قاری کو کہیں دوستوں کی بے وفائی کا ذکر ملتا ہے تو کہیں فلک کی بے مہری بھی دکھائی دیتی ہے، کہیں زمانے کی ناقدری کا بیان ہوا ہے تو کہیں انسان کو ملنے والے فصلی بٹیروں کی دھوکہ دہی کا ذکر ملتا ہے، کہیں دنیا میں رہنے کے لیے انسان دوستی اور ترحم کو لازمی کہا ہے تو کہیں دوستوں کی دوستی پر فخر بھی ملتا ہے لیکن اصل موضوع شاعر عشق ہے خالص مجازی عشق ہے۔ وہی عشق سلطان در شعر سکون، جہاں ہمیں سچے جذبات کی ایک الگ صورت دکھائی دیتی ہے، جہاں شاعر کے جوش میں ایک ٹھہراؤ ہے، جہاں گزرے وقت کی کسک میں ایک تازگی ملتی ہے، جہاں شاعر کے جذبے کی سچائی میں ایک دیوانگی ہے، اپنے عشق میں گزرے کرب کے ہر حوالے پر شاعر کو آج بھی پیار آتا ہے، حسن یار کے خیرہ نگاہی کا بین السطور ذکر ہے تو اپنے جذبات کی لو کی برانگیختگی پر ضبط بھی ملتا ہے۔ عشقِ مجازی کا شاعر سلطان سکون ندرت بیان سے دل جیت لیتے ہیں:

آہ بھر کر ہوں مطمئن ایسے
جیسے اس نے بھی سن لیا ہو گا

.....

سلطان سکون کی شاعری میں کہ جیسا کہ معلوم حقیقت ہے کہ عصری شعور، غم ہائے روزگار، فکرِ فردا، روایات کی شکست اور اقدار کی نئی صورت گری، زندگی کے مزاج کے بدلاؤ سے پیدا ہونے والے حالات و واقعات کا ذکر، یاروں کی محفلوں کا ذکر اور پھر انہی دوستوں سے دوری کا ملال ، ہجر و فراق کے مضامین، تخیل کی ارفعیت، خیال کی اصلیت، بیان کی صلابت، پیشکش کی ثروت، الفاظ کی ندرت، چناؤ کا ہنر، موضوع کی موضوعیت کی کامل برت، قاری دوستی ، بیان کی قطعیت، تجربہ اور مشاہدہ کی اکمل برت، ایجاب واختصار کا فطری ملکہ غزل کی کلاسیکی روایت اور اساتذہ فن کا عمیق مطالعہ، نظم پر کامل عبور، غرض ان تمام اوصاف نے مل کر سلطان سکون کو میرِ عصر حاضر کا خدائے سخن بنا دیا ہے۔

☆☆☆☆☆

# سلطان سکون کی شاعری پر اہلِ ادب کی مختصر آرا

.....احمد ندیم قاسمی.....

ہزارہ کی مردم خیز زمین سے جب مجھے سلطان سکون کی طرف سے ''فنون'' کے لیے غزلیں موصول ہونا شروع ہوئیں تو پہلی ہی غزل سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس شاعر کے لفظوں میں اُجالا ہے اور اس کے شعروں میں روشنی ہے - پھر اتنے گہرے بے لوث خلوص اور اس پر مستزاد مزاج کی اتنی سادگی اور ایثار پیشگی مجھے بہت کم شعرا میں نظر آئی ہے۔

سلطان سکون ایک ایسا شاعر ہے جو اپنے شعروں میں پورے اعتماد کے ساتھ سچ بولتا ہے۔ مبالغہ آرائی اسے چھو بھی نہیں گئی۔ وہ لفظوں کے طوطے مینا بھی نہیں بناتا۔ اتنے رسیلے اور سیدھے سادھے انداز میں جذبے کا اظہار کرتا ہے کہ فن شعر کا سر، بلند ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

---

.....قتیل شفائی.....

صوبہ سرحد میں ہزارہ ایک ایسا خطہ زمین ہے جو ہمیشہ ہر لحاظ سے زرخیز رہا ہے۔ لیکن مجھے اس خطہ کی صرف ذہنی اور تخلیقی سرسبزی اور شادابی کی نشان دہی کرنی ہے۔ ماضی میں جھانکئے تو میر ولی اللہ ایڈووکیٹ جیسے صاحب دیوان شاعر پر نظر پڑتی ہے اور ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے نقاد ہزارے کا نشان امتیاز بن کر پوری اردو دنیا پہ چھائے نظر آتے ہیں - یہ بزرگ اور ان کے دوسرے ہم عصروں ہی کی برکات سے آج ہزارہ کے گلستان شعر و ادب میں بہت رنگا رنگی نظر آ رہی ہے جن میں ایک نمایاں رنگ سلطان سکون کا ہے، جو دلکش تو ہے ہی اپنے جلو میں ایک ایسی تخلیقی خوشبو بھی رکھتا ہے جو اپنی انفرادیت کی وجہ سے دور دور پہنچ رہی ہے اور جس سے پورے پاکستان کا مشام

جاں معطر ہو رہا ہے۔ مجھے دکھ ہوتا ہے جب ہمارے نقاد خصوصاً سرحد کے نقاد سلطان سکون اور ان کے ہم عصر ہزارہ وی شاعری کو اپنی کم توجہی کا نشانہ بنائے رکھتے ہیں۔ میری ان سے گزارش ہے کہ وہ سلطان سکون کا یہ مجموعہ کلام پڑھیں اسے پرکھیں۔ انھیں واقعی اس مجموعہ کلام سے کچھ اچھائیاں ملیں گی۔ پھر اللہ انھیں انصاف کی توفیق بھی دے دے گا۔

---

..... محمد ارشاد .....

سلطان سکون کا شمار ان شعرا میں بآسانی کیا جاسکتا ہے جو معروف بھی ہیں اور مقبول بھی۔ ان کی شاعری سادہ اور پرسوز ہے اور میرے گمان کے مطابق ان کی اپنی زندگی بھی سادہ اور پُرسوز گزری ہے گفت و کردیا کرو و گفت میں مطابقت بہت کم شاعروں کو نصیب رہی ہے ان شاذ و نادر شعرا میں سلطان سکون بھی شامل ہیں۔

شعر گوئی کی تاریخ کا آغاز اسی زمانے سے ہوتا ہے جو الفاظ کی دریافت کا ہے کوئی دور شعر و شاعری سے خالی نہیں گزرا شاید ہر دور میں کچھ باتیں رہ جاتی ہیں اور جو کہی جا چکی ہوتی ہیں انھیں بھی نئے رُخ اور نئے رنگ سے دہرانے کی ضرورت رہتی ہے۔ سلطان سکون نے اپنی شاعری میں بہت سی ان کہی باتیں کہی ہیں اور جب جہاں اور جو کہیں بھی کہی ہیں تو یوں کہ ان کہی لگتی ہیں۔

ان کی شاعری شستہ، شائستہ اور مہذب افکار کا اظہار ہے اور وہ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کے بہت سے اشعار سہل ممتنع کے درجے پر فائز ٹھہرتے ہیں اچھے شعر کی ایک خوبی یہ بھی سمجھی گئی ہے کہ اس کی نثر نہیں کی جاسکتی مثلاً انہی کا شعر ہے:

مری مشکل کا حل کوئی نہیں ہے
ترا نعم البدل کوئی نہیں ہے

.....

اور ایسے اشعار ان کے کلام میں فراواں ہیں وہ جتنے زیادہ خوش فکر ہیں اتنے ہی زیادہ خوشگوار بھی ہیں۔ خوش فکری اور خوش گوئی نے ان کے کلام کی فضا کو اس حد تک خوشگوار بنا رکھا ہے کہ اس میں بار بار سانس لینا صحت بخش محسوس ہوتا ہے۔

---

.....آصف ثاقب.....

ہزارہ کے ادبی سرمائے میں سلطان سکون کی غزلوں کے کئی شعر بیش قیمت موتیوں سے کم نہیں جن کی چمک دمک سے ذوق سلیم شعر

فہمی کی درست سمتیں متعین کرتا ہے۔ سکون کی غزل کا لہجہ دل میں تیر بن کر گرتا ہے وہ پُر افشاں نہیں نکلتا بلکہ پیوست ہو کر لہو میں ایسا ارتعاش پیدا کر دیتا ہے جو دردمندی کی بے تابیوں سے خاص ہے۔ یوں تو اچھی غزل کہنے والے اور بھی بہت سے ہیں مگر سلطان سکون نے غزل کے لہجے کو جیسے بامراد کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ جدید ڈکشن کی جانب اس نے زیادہ توجہ نہ کرتے ہوئے بھی عصری تقاضوں کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جہاں اس نے غزل میں اعلیٰ روایتوں کا التزام برتا ہے وہاں عصریت کی تازہ کاریوں کا سامان بھی کیا ہے۔ جدید فکر کو سکون نے اپنی مخصوص شعری افتاد کے حوالے سے اپنا بنایا ہے۔ یہی اس کی غزل کی پہچان ہے اور اس کے تغزل کی آبرو۔ یہ شناخت سلطان سکون کی برسوں کی ریاضت کا ثمرہ ہے۔ اس نے غزل کے پیرائیوں کو احساس غم کے وضع کردہ دستور کی طرح برتا ہے اس ضمن میں اس کا اخلاص غزل کا دردمند لہجہ بن کر ابھرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے کڑے سے کڑے ہمہ گیر انتخاب میں بھی سلطان سکون کی غزل کو نظر انداز نہیں جا سکتا ہے۔ آخر پر ایک بحر سے سکون کے تین مطلعے سناتا ہوں:

درخت کٹتے گئے اور مکان بنتے گئے
ہمارے سر پہ کئی آسمان بنتے گئے

کوئی نہ کوئی تو تحفہ ضرور گھر لے جا
نہیں کچھ اور تو چہرہ شگفتہ تر لے جا

وہ عمر بھر کی رفاقت کا اتنا پھل دے گا
دکھوں پہ صبر کی تلقین کر کے چل دے گا

---

..... محسن احسان .....

سلطانوں کو سکون تو میسر نہیں لیکن سلطان ایسا شاعر ہے جس کی ذات کے اندر ہزار طوفان اٹھیں اور لاکھ آندھیاں چلیں وہ پُر سکون دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے اس کا کلام اس کی زندگی کا صحیفہ ہی نہیں اس کی ذات کا دلکش اور لطیف اظہار بھی ہے وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہے جو کلاسیکی اور جدید غزل کی فنی ساخت سے بخوبی آگاہ ہے اور غزل جیسی نازک صنف سخن کے رنگ و آہنگ کو نہ صرف معتبر رکھے ہوئے ہے بلکہ اس کی آبرو بڑھانے میں اک عمر سے سرگرم عمل ہے۔ وہ ایک حساس اور دردمند انسان ہے اس کے فن میں زندگی اور تغزل کا بھرپور توازن ملتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں اس کے لہجے میں

ڈھل کر اس کی شاعری کو تر و تازہ رکھے ہوئے ہیں:

نہیں کہ چوٹ جو دل پر لگی ہے کاری نہیں
ہر اک سے کہتے پھریں ہم یہ خوبھاری نہیں
ہمیشہ ہم نے اٹھایا ہے دوستی میں زیاں
وہ اس لیے کہ مزاج اپنا کاروباری نہیں

یا

مری مشکل کا حل کوئی نہیں ہے
ترا نعم البدل کوئی نہیں ہے
وہاں کیا فائدہ جہد و عمل کا
جہاں ردِ عمل کوئی نہیں ہے

.....

یہ شاعری حُسن و عشق کی رسمی اور روایتی شاعری نہیں بلکہ جذبات کے تموج اور احساسات کے تلاطم میں گھل کر وجود آئی ہے۔

---

..... شبنم رومانی .....

ایبٹ آباد (ہزارہ) کا شیریں مقال سلطان جب بھی نظر آیا بے تاب ہی نظر آیا، پُر سکون کبھی نہیں ملا۔ ویسے بھی کسی سلطان کو سکون کب میسر آتا ہے! سکون میسر آ جائے تو شعر کی سلطانی کیسے میسر آئے؟ شاعری تو گھاٹے کا بیوپار ہے، سکون بیچ کر جنون خریدنے کا سودا بقول اعتبار الملک شاہ جہاں پوری:

درحقیقت مضطرب دل کے لیے وہ موت تھی
اصطلاح عام میں "تسکین" جس کا نام تھا

.....

سلطان سکون اب ایک خود اعتماد حرف نگار کے طور پر تخلیقی دنیا کے سامنے آیا ہے۔ اس کی شاعری کے ڈانڈے ماضی اور مستقبل سے دونوں جہتوں سے ملتے ہیں، ماضی کی کلاسیکی دردمندی سے اور مستقبل کی اجتہادی آرزومندی سے! رومانس اب بھی اس کے ہاں ہے، مگر بلوغت فکر کے ساتھ سلطان سکون مجھے اس لیے بھی بہت عزیز ہے کہ وہ ابھی تک خود کو زندگی اور ادب کی اعلیٰ اقدار سے جوڑے ہوئے ہے۔ وہ اس تہذیب کا دفاع کرتا نظر آتا ہے جو صدیوں کا سفر طے کر کے اس تک پہنچی ہے۔

ہمیں ہے ناز تہی دامنی پہ اپنی سکوں
اسی نے اپنی طبیعت کو خسروانہ کیا

.....

یوں سکون ان معدودے چند شاعروں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے جو محض زندگی کے لیے ادب نہیں لکھتے بلکہ ادب کو زندگی بنا لیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

# غزل

جب بھی کوئی دیرینہ شناسا نظر آیا
صحرا میں گھنے پیڑ کا سایہ نظر آیا

جب آ کے ہوا دست و گریباں غمِ دوراں
پھر کوئی بھی اپنا نہ پرایا نظر آیا

کھاتی رہی دھوکے یہ مری سادہ نگاہی
ایسا نہیں نکلا کوئی جیسا نظر آیا

ہم دل زدگاں گا تو یہی طور رہا ہے
جا بیٹھے جہاں پیار کا سایہ نظر آیا

تفصیل سے جب پرسشِ حالات ہوئی تو
ہر آدمی اندر سے شکستہ نظر آیا

ہے میرے نگر پر کسی آسیب کا سایہ
کچھ روز بھی ڈھب سے نہیں بستا نظر آیا

جا لپٹا ہوں مجذوب سرِ راہ گزر سے
کچھ اُس میں مجھے اپنا حوالہ نظر آیا

چاہا تو بہت ہم نے سکون اُس کو بھلا دیں
ایسا نہ مگر کوئی طریقہ نظر آیا

سلطان سکون

# غزل

خوشیوں کا نتیجہ کیا نکلا صدمات کا کیا انجام ہوا
جس بات پہ اتنی بات بڑھی اس بات کا کیا انجام ہوا

جو گام اُٹھایا تھا ہم نے اس گام پہ ہے کیا ہنگامہ
جو ہاتھ بڑھایا تھا ہم نے اس ہات کا کیا انجام ہوا

یہ عشق و محبت کی بازی کچھ جیت گئے کچھ ہار گئے
اس جیت کی کیا توقیر ہوئی اس مات کا کیا انجام ہوا

بے کار کا رونا دھونا ہے پتھر پہ اثر کیا ہونا ہے
پہلے بھی بہت برسات ہوئی برسات کا کیا انجام ہوا

گو دل کو لگی معیوب نہیں جذبات میں بہنا خوب نہیں
سلطان سکون سے بات کریں جذبات کا کیا انجام ہوا

سلطان سکون

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جب بونے لگا بیج خیالات کے خالد
ہر لفظ کا دامن مجھے بنجر نظر آیا

# غزل

وہ عمر بھر کی رفاقت کا اتنا پھل دے گا
دُکھوں پہ صبر کی تلقین کر کے چل دے گا

کشید کر کے گلِ جاں کی ساری خوشبوئیں
پھر اس کے بعد زمانہ تجھے مسل دے گا

تجھے ہوا ہے جو شدت سے رنجِ ناکامی
یہ رنج ہی تو تجھے دعوتِ عمل دے گا

خرد کی بات میں کچھ مصلحت بھی ہوتی ہے
جنوں نے جو بھی دیا فیصلہ اٹل دے گا

عدو برا کہے جتنا ترے مفاد میں ہے
کہ اس طرح سے وہ کچھ زہر تو اُگل دے گا

میں اُس کو بھول تو جاؤں مگر سوال یہ ہے
زمانہ اُس کا مجھے کون سا بدل دے گا

سکون درد کے پودے کو سینچتے رہنا
یہ پیڑ بن کے تجھے پھول پھل دے گا

سلطان سکون

# غزلیں

مری مشکل کا حل کوئی نہیں ہے
ترا نعم البدل کوئی نہیں ہے

لہو اس پیڑ پر چھڑکا ہے اپنا
کہ جس پر پھول پھل کوئی نہیں ہے

وہاں کیا فائدہ جہد و عمل کا
جہاں ردِعمل کوئی نہیں ہے

دلوں میں سینکڑوں گرہیں پڑی ہیں
مگر ماتھے پہ بل کوئی نہیں ہے

سکون اس کی وفا کا کیا بھروسہ
کہا جس کا اٹل کوئی نہیں ہے

## سلطان سکون

سوچتا تو میں بھی ہوں تیرے پاس آنے کا
پھر خیال آتا ہے کیا کروں زمانے کا

دردوغم زمانے کے سہہ رہا ہوں، سہہ لوں گا
حوصلہ نہیں مجھ میں تیرے دکھ اُٹھانے کا

حال پوچھ کر احباب یہ بھی پوچھ لیتے ہیں
مشورہ دیا کس نے تم کو دل لگانے کا

عشق دیکھتا کب ہے کوئی کون ہے کیا ہے
تم کسی گھرانے کے وہ کسی گھرانے کا

اُس کی اک جھلک ناصح میں تمہیں دکھا دوں گا
مجھ سے مت گلہ کرنا ہوش میں نہ آنے کا

دو دلوں کی چاہت کے درمیان آ جانا
کاش کہ بدل جائے یہ چلن زمانے کا

شکر یہ سکون اُن کا چاہتے ہیں جو مجھ کو
آدمی نہیں ورنہ میں کسی ٹھکانے کا

# اینڈ آف ٹائم

حُسنِ اتفاق کہ اُس روز ہوا کے ہر جھونکے میں نمو کی مہک رچی تھی اور ایسا شاید قرنوں کے بعد ہوا تھا- زندگی کی اولیں محبت بننے والے بیکٹیریا، بیسی لائی (Bassilie) کے صدیوں سے مُردہ بدن میں ہوا میں رچی نمو کی وجہ سے زندگی نے کلبلانا شروع کر دیا تھا-

''بیسی لائی'' بے حد خوش اور ایکسائٹڈ تھا...... کہ زندگی کا طلسماتی معجزہ اُسے پھر کبھی عطا ہو گا، اس نے کبھی تصور تک نہ کیا تھا......

پھر اسی لیے زندگی کی کسمساہٹ بدن میں محسوس کرتے ہی اُس کے اندر خواہشوں کے لکر متے جاگنے لگے......اور خواہشوں میں سے جو خواہش وقت کے فنا فی اللہ ہو جانے کے باوجود مسلسل اُس کے ساتھ رہی...... وہ ''محبت'' کی تھی- پھر وہ، ہر سُو پھیلے حق ہُو کے عالم میں خاک کے اس ذرے سے اُس ذرے میں، اور ہوا کے اس جھونکے سے اُس جھونکے کے دوش پہ ڈولتا، ''کوکائی'' کی تلاش میں بھٹکنے لگا......

کہ زندگی کی بڑھت اور ارتقا کے سفر میں ''کوکائی'' کے بغیر وہ بالکل اس کسان کی طرح تھا، جس کے پاس ہل اور پانی تو موجود ہو لیکن زمین جسے وہ ہرا بھرا کرنا چاہے......ایک چپہ بھی موجود نہ ہو......

پھر ایک روز اچانک وہ اُس کے پاس پہنچا- ''کوکائی'' کے قریب، جو شہد کی بڑی مکھی کی طرح سرنہیواڑے نے بھن بھن کرتی، تخلیق کی دردِ زہ سہہ رہی تھی......اور زندگی کو جلا بخشنے کی مسرت میں اس طرح مگن تھی کہ اُسے بیسی لائی کی موجودگی کا کوئی احساس تک نہ ہوا......

کب سے میں موقع کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتا ہوں کہ تم ذرا ستانے بیٹھو، تو میں تم سے تمھارے بارے میں بات کروں- اردگرد کوئی ذی روح بھی موجود نہیں- تم سرنیہواڑے اکیلی مشقت میں بُری طرح جُتی ہو......انیکتا کو ایکتا میں تبدیل کرنے کی سعی میں اردگرد سر اٹھا کر دیکھتی تک نہیں- میں ایک مدت سے اِدھر اُدھر بھٹکتا ہوں- اسی انتظار میں ہوں کہ تم ذرا ستانے بیٹھو تو...... میں تم سے تمھارے بارے میں کچھ دریافت کروں، جس تخلیقی کاوش میں تم سرگرداں ہو، اس کا راز معلوم کروں...... ''بیسی لائی'' نے کوکائی کے قریب بیٹھ کر خوشامدانہ لہجے میں کہا-



پروین عاطف

وقت کے وجود کا تو ان دونوں ہی کو کوئی احساس نہیں تھا..... کیونکہ واقعات نے اُسے بہت پہلے لاوجود کر دیا تھا..... اور سپیس.....؟ اُسے بھی دُھول بن کر خلاؤں میں تحلیل ہوئے ازمنے بیت چکے تھے.....

''کوکائی'' (افزائش کے بیکٹیریا کا دوسرا نصف وجود) کی ہمت تھی کہ گدلے، بدبُو دار خلاؤں میں سے، وہ حیات کی ہریالی اور نمو کو دوبارہ زندگی کرنے اور اسے بڑھانے میں لگی تھی..... مہ و سال کی شدید محنت کے بعد اب وہ تھوڑے سپیس کو واقعی ہرا بھرا کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی.....

''کوکائی'' کے اردگرد کی زمین سے معمولی ٹکڑے میں ہریالی اور نمو کو دیکھ کر، بیسی لائی بوکھلایا ہوا تھا..... تخلیق اور ارتقا کی نوید نے اُس کے اندر کی اتھاہ طاقت کا احساس پیدا کر دیا تھا..... اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ ''بیسی لائی'' کی اجازت سے اُس کے عظیم پراجیکٹ اور سکیم کا حصہ بن جائے..... یا اللہ..... ''کوکائی'' کا بظاہر ناتواں، نرم و نازک وجود اندر سے کس قدر پُرعزم اور باہمت ہے..... کہ اُس لامنتہا، خلا میں جہاں انسانوں کی ہڈیوں کے گلے سڑے ڈھیر یا عجیب الخلقت جانوروں درندوں کے سوا کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ زندگی کو گندم کی بوائی کی طرح بونے کی کوشش کر رہی ہے.....

اور اب جبکہ وقت کا کوئی تصور یا بانٹ موجود نہیں۔ میں اس شدید تڑپ میں مبتلا ہوں کہ ''کوکائی'' مجھے اپنے ساتھ شامل کر لے۔ بار بار میرے دل میں یہ احساس بھی جاگتا ہے کہ میں اور ''کوکائی'' ایک دوسرے کو کئی صدیوں سے جانتے ہیں..... ایک دوسرے سے جُڑے ہیں..... اور کائنات کے مٹے مٹے نقوش میں دوبارہ رنگ بھرنے کی ڈیوٹی ہمارے ذمے کسی اور نے لگائی ہے..... کسی عظیم طاقت نے.....

''کوکائی'' اپنے سپیس (Space) کی ہریالی کو بُن بُن کر جب بُری طرح تھکی..... اور ستانے بیٹھی تو اُس نے ''بیسی لائی'' کو دیکھا، جو مسلسل اُسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی عظمت کا مینار ہو۔ اور اُسی کے وجود کا کوئی گمشدہ حصہ ہو.....

سُنو تم مجھے اس طرح تجسس اور تحیر سے نہ دیکھو۔ میں اُس ہریالی کی تپسیا یا دیکھ رہی، کسی ذہانت یا چالاکی سے نہیں کر رہی..... نہ ہی کسی سوچ یا منصوبے کے تحت میرے دھور اندر، جبلی طور پر ایسا کچھ ودیعت کر دیا گیا ہے جو مجھے نچلا نہیں بیٹھنے دیتا جلدی جلدی کی میرے اندر کوئی پھرکی ہے جو مجھے تخلیق اور پھیلاؤ پر اکساتی ہے.....

''تمھارا نام پوچھ سکتا ہوں۔''

ابھی ابھی تو ملے ہو..... نام کی اہمیت اور تجسس ملن کی اولین گھڑی تو اُجاگر نہیں ہوتے۔ اولین گھڑی تو صرف ایک دوسرے کے وجود کا احساس جاگتا ہے۔ دیکھنے کی خواہش اُجاگر ہوتی ہے..... آنکھ مطمئن ہو..... جی کو اچھا سگنل ملے، تبھی تو نام پوچھا جاتا ہے ایک دوسرے سے..... میرے وجود میں نصب میری قرنوں کی یادداشت میں ایسا ہی لکھا گیا ہے..... دوسری بات یہ ہے کہ..... ''کوکائی'' نے بیسی لائی کے قدرے قریب ہوتے ہوئے بتایا۔ جب میں پیدا

ہوئی تو میرا نام رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ میری ماں، جس کے بدن کی بوسیدہ ہڈیوں سے میں اُٹھی..... کیچڑ کے بڑے بڑے سیاہ کھپڑوں میں لپٹی تھی..... اور میرے پاس اُس کی پہچان کے لیے، اُس کی آنکھوں کے خالی، بے نُور کوئے اور ناک کے دو ٹیڑھے میڑھے زرد سوراخوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا..... وہ اپنے چمکیلے سیاہ بالوں اور نیلی آنکھوں کی وجہ سے پورے قبیلے میں الگ دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اس روز جب میں اس کی رانوں کی جلی ہڈیوں سے جاگی۔ سیاہ گھنیرے بالوں کی جگہ اُس کی جلی ہوئی کھوپڑی پہ قلمی شورے کی تہیں جمی ہوئی تھیں..... تمھاری کہانی المناک ہے۔ میرے ہونے کے واقعات بھی کچھ کچھ تم سے ہی ملتے جلتے ہیں۔ لیکن میں نے اپنی ماں کو بغور دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

"جیسی لائی" نے طویل سانس کھینچ کر کہا.....

تم میرے کام میں مخل ہو رہے ہو جو میرا دین دھرم ہے۔ لیکن تم سے باتیں کرنا مجھے اچھا لگتا ہے اس لیے میں چاہتی ہوں، میں تمھیں اپنے کل احوال سے آگاہ کروں۔ پیدا ہونے کے بعد میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ لق و دق صحرا، جانوروں، انسانوں، چرند پرند کی کروڑوں جلی بھنی، اینڈی بینڈی نعشیں..... راکھ ہو چکے گھروں اور عمارات کا اِکا دُکا نشان..... دریاؤں میں بہتا، سنڈاس بھرا زرد پانی..... تیزاب سے لدے چشمے..... اُف توبہ! میں تمھیں کس طرح بتاؤں میں کیونکر پیدا ہوئی اور میں نے کیا کچھ دیکھا.....

اب وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے بے تکلف ہونے لگے تھے۔ ایک دوسرے کی قربت انھیں اپنے ہونے کا گھنا ثبوت دے رہی تھی..... تو میں کونسا جنت الفردوس سے اُترا تھا۔ ہماری کہانی ملتی جلتی ہے..... زندگی میرے اندر اس اندھے خلا میں پہلے پہل کلبلائی تو سُرخ آنکھوں اور بڑے بڑے پروں والے خونی کاکروچ، طاغوتی چوہے، لگڑ بگے جو انسانوں کے گلے سڑے ماس کھا کر دندناتے ہیں۔ میرے اردگرد مجھے ہڑپ کرنے کو جمع ہوئے اور میں یہ بھی جانتا تھا..... دنیا جب موجود تھی اور انسانوں نے اپنی اپنی "میں" کی کلغی پھیلانے کی خاطر ایک دوسرے پر ایٹم اور ہائیڈروجن بم چلائے تھے..... تو بھی وہ مخلوق تھی، جسے بموں کا زہر فنا نہیں کر سکا تھا..... اور یہی وہ مخلوق ہے جو اب بھی اس جگہ پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے پر بضد ہے.....

لیکن اب ہم دونوں ایسا نہیں ہونے دیں گے..... ہم دونوں تخلیق اور نمو کا بھرم رکھیں گے..... "جیسی لائی" نے مشفقانہ انداز میں کہا،

"تم جو کوئی بھی ہو..... میں تمھاری بات سمجھنے کوشش کر رہی ہوں..... اور مجھے لگتا ہے کہ تم سچ کہنے کی کوشش کر رہے ہو..... مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ میں تمھاری باتیں پہلے بھی سُن چکی ہوں۔"

"اوپر والا منچلا ہے۔" جیسی لائی نے دُور خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

کبھی بناتا ہے پھر مٹاتا ہے، پھر شرارتی بچے کی طرح سب مٹا کر فارغ ہوا تو بور ہونے لگا..... نہ کہیں کوئی نیکی نہ بدی، نہ شور نہ ہنگامہ، نہ میں نہ تُو..... نہ ازل نہ ابد..... تب ہمارے ہو جانے کا حکم ہُوا اور اب تم خود ہی دیکھو تم کس

طرح محنت کر رہی ہو......

یہ بُھوسلا بدنما خلا......اور وہ سارے درندے، جو اب زمانوں سے اپنے بہیمانہ کھیل رچائے بیٹھے ہیں...... جن کا ہونا شیطان کی قوت کا مظاہرہ ہے۔ میں اور تم عہد کرتے ہیں کہ دوبارہ اب ہم کائنات میں کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گے......

ازل تا ابدلی...... وقت اب فنا نہیں ہوگا۔

جب ہوا کا بے مایہ سا ذرا تمھیں اُٹھا کر میرے پاس لایا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ تم ''وقت'' کی موت، اور ہماری دوبارہ زندگی کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہو۔ میں نے تمھارے ساتھ گفتگو کا آغاز محض لحاظ کے طور پہ کیا تھا۔ لیکن اب میں خوش ہوں کہ تم مجھ سے ملے۔ اور تمھاری قربت میرے اندر، آگے بڑھنے کی ایک انوکھی امنگ پیدا کر رہی ہے...... آگے بڑھنے اور وقت کو مضبوط بنانے کی امنگ...... اور تمھاری قربت نے پورے ماحول میں ایک خوشبو رچا دی ہے، جو انتہائی ارفع اور مسحور کر دینے والی ہے......

اور یہ ہم دُور دُور، بے قراری سے اِدھر اُدھر بھاگتے لنگڑے کاکروچ اس لیے بھی گھبرائے ہوئے ہیں کہ انسان جو وقت کے ساتھ ہی راکھ ہو چکا تھا، کہیں دوبارہ تو وارد نہیں ہو رہا، کوئی نیا رُوپ دھار کر......

''میسی لائی'' کوکائی کے سوال پر قہقہہ لگا کر ہنسا......

جواب باتوں کے ساتھ ساتھ دوبارہ اپنے کام میں جت گئی تھی اور میسی لائی سے قُربت کے نتیجے میں، اَن گنت بیکٹیریا (Becteria) اس کے بطن سے پیدا ہونے لگے تھے......اور وقت کے ہونے نہ ہونے کا احساس تو ابھی تک، نہ ہونے جیسا مندا مندا سا تھا......

یزداں اور اہرمن کے درمیاں بچھی بساط کو ہم دونوں سمجھ سکتے ہیں، نہ یہ اُوٹ اُونٹ چلتے خونی پھنکار والے کاکروچ...... اور دوسرے درندے، وہ سارا کھیل تو شروع ہی شرط بدھنے سے ہوا تھا...... رب نے اُسے کھل کر کہا تھا کہ جس روز انسانوں میں تم خناس بھر بھر کر حنف جاؤ گے...... اور اپنی خبیث حرکات کی وجہ سے روشنیاں گُل کر دو گے تو کسی آوارہ بدمعاش ڈاکو کی طرح فنا کا بہیمانہ قتل کھیلو گے...... دھماکے ہوں گے...... پہاڑوں کو سُرمہ کرنے اور سمندروں کو بستیوں پہ چڑھا دینے والے دھماکے...... آگے کے ارض و سما کو بھسم کر دینے والے بہیمانہ شعلے...... بھڑکیں گے...... اور انسان کا پھول سا دو دانت والا کلکاریاں مارتا بچہ موتیے کے ادھ کھلی کلی، مُندی مُندی آنکھوں والا گھونسلے میں بیٹھا چڑیا کا بوٹ، صبح کا تارا، دلہن کی شرمیلی مسکراہٹ ماں کی نیم شبی دُعا، گندم کی پہلی سنہری بالی...... جب یہ سب فنا ہو جائے گا، تو اے ابلیس! تم جانو گے جیسے تمھاری جیت ہوئی...... لیکن تم یہ بھول جاؤ گے کہ ہست کی بازی، میں سدا اپنے ہاتھ رکھتا ہوں...... اور اسے اپنی مرضی سے کھیلتا ہوں......

اور تم یہ بھی جان لو کہ وقت کبھی نہیں مرتا، ایٹم کے امٹ دوزخ برس جانے کے بعد بھی...... خالق دو جہاں کہتا۔ جو عجیب و غریب گفتگو تم مجھ سے کر رہے ہو، اُس نے میرے پورے وجود کو سان پہ چڑھا دیا ہے...... میرے ڈی این اے میں کھلبلی

مچ گئی ہے۔ نیوران، نیوران کا ٹکراؤ ہونے لگا ہے......اور جس طرح کسی بڑے نے کہا تھا...... ڈی۔این۔اے کے کمپیوٹر میں، ازل سے ابد تک کی انسانی یادداشتیں بند ہوتی ہیں، تو مجھے بھی لگتا ہے......میری یادداشتوں میں، میرے سینکڑوں جنموں اور ازمنوں کی سی۔ ڈیاں بند پڑی ہیں تمھاری باتوں نے جن کے پرت کھولنا شروع کر دیے ہیں......

کسی فلم کے پرومو کی طرح جھلکیاں اُبھرتی ہیں، پھر تارے کی طرح جھلکے سے ڈوب جاتی ہیں......پر میں اب وثوق سے کہہ سکتی ہوں...... کہیں کچھ تھا......عظیم، پُراسرار اور لازوال حُسن کا مالک، جو ہم سے چھنا......راکھ ہوا......اور اب اُسے جاننا......دوبارہ حاصل کرنا، ہم دونوں پرواجب ہو گیا ہے......پھر یوں ہوا کہ ''جیسی لائی'' سے بات کرتے کرتے اُسکی یادداشت کا کوئی در وا ہو گیا......اور زخمی انسانوں کی کراہوں، خوفزدہ انسانوں کی چیخ و پکار، ماؤں کی اپنے چیتھڑا بکھرے بچوں کے لیے مدد مدد کی پکار نے کوکائی کو حواس باختہ کر دیا......اور اپنے ہرے بھرے گھاس کی بُنت اور وہ اپنے دوست ''جیسی لائی'' کی قربت کا لطف چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ اُس کی دردناک یادداشتوں نے اُس کی تخلیق کے سوتوں پر بندھ باندھ دیے تھے۔ پر کوکائی کے پاس بھاگ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں تھی......وہ جس طرف رُخ موڑتی، وہاں اُسے ایٹم کے بیج بستے دھوئیں......زمین کے ساتھ ساتھ رینگتے آگ کے شعلوں، آگ تھوکتے کوبرا سانپوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا......یا پھر پہاڑ پہاڑ جیسی کوڑھ کرلیاں اور کاکروچ......جو جہاز جیسے پر کھول کر انسانوں کے پیچھے بھاگ سکتے تھے......اس کا راستہ روک لیتے......منہدم شدہ عمارات کے ملبے میں دبے ہوئے کٹے پھٹے انسان، اُسے مدد کے لیے پکارتے تو وہ خوفزدہ ہو کر واپس جیسی لائی کی طرف بھاگتی......

تمھارے آنے سے پہلے، مجھے صرف یہی شعور تھا کہ مجھے کچھ کرنا ہے......لیکن اب یہ میری یادداشت کے خوفناک دریچے......کسی ایک کے کھلنے سے بھی میری رُوح کانپنے لگتی ہے......وہ جو کبھی عظیم، پُراسرار اور مسحور کن تھا......نُور خوشبو......قوت......محبت......حسن، سب تاریکی میں ڈوبا دکھائی دیتا ہے......سُرخ رُخساروں، سیاہ چمکیلی آنکھوں والے بچوں کے پھُول سے بدنوں کو چوہے کترتے ہیں، زرد تیزابی دریا، ایٹمی سرما میں جم کر برف کے وسیع میدان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جو زندہ ہیں، اُن کے بدن سے نکلتی ہر شعاع میں بم کا وہ زہر ہے جو ایک پورے شہر کو بھسم کرتا ہے......چیخ و پکار، بھگدڑ......بدامنی......دھماکے......میری یادداشت......میرے لیے عذاب ہے......شکر کرو، تم تاریخ سے اور وقت کی مکمل موت سے کسی حد تک غافل ہو......لیکن، تم یقیناً اس لحاظ سے مجھ سے ارفع ہو......اس اتنے بڑے لازوال فنا کے ڈرامے میں، جب کائنات کے ہر شیخی خور طاقتور نے ایک دوسرے پر اپنے اپنے، ایٹموں کی بارش برسائی، خلقِ خدا......

اشرف المخلوقات......لکڑی کے بُرادے کی طرح ڈھیر ہوئی...... سمندروں کی پہاڑ پہاڑ اونچی لہریں، شہروں پہ چڑھ آئیں...... تمھاری یادداشت کا بلیک باکس جُوں کا تُوں محفوظ رہا......

تعجب......تحیر......

جس یادداشت کو تم عذاب سمجھتی ہو، وہ زندگی کے تسلسل اور ارتقا کی ایک ارفع منزل بھی ہے۔ یزداں کا کوئی الگ سا بھید ہے کہ تاریخ تمھاری یادوں میں بحفاظت موجود ہے اور میں اس سے بہت حد تک محروم ہوں۔ مجھے صرف اب اور آج، یا کچھ کچھ کل کا شعور دیا گیا ہے۔ یا پھر، ماں کے گلے سڑے بدن سے ازخود پیدا ہونے کے بعد، ایک اہم حقیقت کا ادراک مجھے ودیعت کیا گیا تھا کہ محبت کرنا اور محبت حاصل کرنا ہی انسان کی مکمل فنا کا مداوا کرسکتا ہے۔ ورنہ حیات کا گیت مکمل نہیں ہوسکتا......"بیسی لائی" نے کوکائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

تمھاری بُو واقعی مسحور کن ہے......طلسماتی سی......

جب تک میں تم تک نہیں پہنچا...... بے حد خوفزدہ رہا۔ حالانکہ، زندگی کا اولیں "بیکٹیریا" ہو یا انسان، جنم کے فوراً بعد اس کے اندر انسانوں، جانوروں یا درندوں کا کوئی خوف موجود نہیں ہوتا لیکن پیدا ہونے کے فوراً بعد میری متجسس نگاہ جب اُن پھولے پھولے بدنوں والے سیاہ چوہوں پر پڑی جو انسانوں کے گلے سڑے ڈھانچوں پہ چڑھے، اُن کا گوشت کھروچ رہے تھے......صحرا کے زرد ملبے سینے پہ لوٹتے کوڑیالے سانپ، ہاتھی قد کوڑھ کرلیاں...... بدبُو سے اَٹی تاریکی، جگہ کے پار اُترنے والی انسانی آہ و بکا......

تو میں خوف سے سُکڑ کے ایک سیاہ نقطے میں ڈھل گیا......لاغر، ناتواں......اور پھر میں نے رب سے دُعا کی کہ مجھے اس عذاب سے نجات دلا......مشکل آسان کر اور کوئی وسیلہ پیدا کر کہ میں اپنی منزل پہچان سکوں، اور یہ اسی دعا کا نتیجہ ہے کہ میں تم تک آن پہنچا اور اب تمھارے گرد تیزی سے پھیلتی اس ہریالی اور نمو کا لطف اٹھانے لگا ہوں......

یہ بھی ان دونوں کی قربت اور یکتا کا نتیجہ ہے کہ وقت جو ایٹم اور ہائیڈروجن کے زہر میں جانے کب سے مر چکا تھا......دوبارہ پیدا ہو رہا تھا......

اور کوکائی گھبرا رہی تھی کہ "بیسی لائی" سے باتیں کرتے کرتے، اُس کا کام بیچ میں رہ گیا تھا......

"بیسی لائی" کو لگتا تھا، "کوکائی" اس کے ناتواں بدن کو نئی قوت بخش رہی تھی، جینے اور آگے بڑھنے کی نئی اُمنگ......کوکائی، پیاری کوکائی، میں محنت سے نہیں گھبراتا، تمھارے کام میں دلجمعی سے ہاتھ بٹاؤں گا......اس وقت تمھاری توجہ، تمھارا اپنا پن میرے دل پر دستک دیتا ہے......میرے محبوس ذہن میں کھلبلی مچاتا ہے......دھوراندر کی مقفل تصویروں سے دھول اُڑنا شروع ہوگئی ہے......خدارا! کچھ دیر......کچھ دیر......

کوکائی کو بھی محسوس ہوا کہ اشیاء کی ہیئت آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگی تھی۔ قیام کا احساس ایک بار پھر اُبھرنے لگا تھا۔ پہاڑ دوبارہ اپنی اصل حالت میں واپس آ رہے تھے...... جمے ہوئے زہریلے پانیوں کی سنڈاس کم ہونے لگی تھی......آسمان پہ نیلا تارہ

اُبھر آیا تھا اداس ہوا ڈھلی ڈھلی سی ہو گئی...... اور وہ......
محض سب اُن دونوں "میسی لائی" اور کوکائی کی دو گھڑی کی سنگت کا نتیجہ تھا کہ محبت جو خود، خالق دُنیا ہے اور کبھی فنا نہیں ہوتی ان دونوں کے دلوں میں پیدا ہو رہی تھی۔ نئے سرے سے...... صدیاں پاٹ کر...... کاکروچ، چھپکلیاں، چوہے، اژدہے گنگ تھے...... اُن دونوں کی یہ نئی کیفیت دیکھ کر، ڈرے ڈرے سے لگ رہے تھے...... ڈرے ڈرے اور بوکھلائے ہوئے......

تمھاری باتوں کا جادو ناقابلِ بیان ہے...... یاد آتا ہے، کہ تمھاری ایسی ہی مدھر باتیں صدیوں سے بھاتی تھیں اور میں نے اپنا وجود تم سے جوڑنے، تمھارے سپرد کرنے کی خواہش میں، وہ کچھ کیا جو امٹ داستانوں میں ڈھل گیا...... سسی، ہیر، سوہنی...... طوفانوں سے ٹکراتی چتا کی آگ میں جلیں...... کھلی آنکھوں سنگسار ہونا قبولا۔ پر تم، زیادہ تر اپنی ذات اور دولت کے گھسن گھیر میں اُلجھے رہے...... اور میرے سارے جنم، سارے زمانے تمھارے انتظار اور خواہش میں خاک ہوئے......

اور اب پھر...... تمھاری قربت نے میرا سب اُتھل پتھل کرنا شروع کر دیا ہے...... جذبوں کی یہ انوکھی ہلچل...... ہاں مجھے یاد ہے...... ہم اُن دنوں بھی ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ اُن قیامت خیز مہینوں میں، جب وقت ابھی مرنے اور جینے کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ "ڈیزی کٹر"، کلسٹر اور چور بموں سے بھرے امریکی نام ہاک، بی (52) باون جہاز دندناتے ہوئے آتے تھے اور بستیاں، زمین، اور ٹھنڈے میٹھے پانیوں سے بھرے دریاؤں پر، انھیں گرا کر چلے جاتے تھے......

اب تمھیں یقیناً یاد آ گیا ہو گا کہ لٹے پٹے افغان مہاجروں کے کیمپ میں، میں رضاکارانہ طور پر تم سے پہلے کام کر رہا تھا۔ افغانستان کے شہروں میں کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے۔ اور ہم چند ڈاکٹر، اُن میں سے بچے کھچے زخمی بچوں اور عورتوں کو بچانے کی خاطر، شب و روز محنت میں مگن تھے۔ سروں کے اوپر سے گزرتے جہازوں کی گھن گرج نے ہمیں دیوانہ بنا رکھا تھا۔

پھر اس ٹوٹے پھوٹے، برباد ہجوم میں کہیں سے میری زندگی میں تم وارد ہو گئیں۔ جلی بھبھل زمین میں بھی اچانک کہیں محبت کے لقتے جل اُٹھتے ہیں...... یہ تم سے ملنے کے بعد سمجھ میں آیا......

تم نے پھر ایک دن مجھے ایک گلِ لالہ سی بچی کے زخموں پہ پٹی لگاتے ہوئے کہا تھا...... اس امریکی آگ نے تو، بستیوں کے ساتھ ساتھ ان کی کہانیوں کو بھی فنا کرنا شروع کر دیا ہے...... خوشبو، کوملتا اور موسیقی کا بھی کہیں کوئی نشان باقی نہیں رہا...... تم نے یہ بھی آنسو پونچھتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ میں پاگل ہوں۔ ایسی بارود کی زہریلی بارش میں کوئی کہانی، خوشبو یا سُر کے زندہ رہنے کے امکانات کہاں رہتے ہیں...... اگر کوئی کہانی، باقی بچ جائے تو آگ اور خون کی ہولی میں ننھے بچے کی طرح ڈر کر زیرِ زمین چھپنے لگی ہے...... تاکہ کبھی کوئی اور زمانہ انگڑائی لے۔

وقت کے دوبارہ زندہ ہونے کی نوید چلے تو...... وہ بھی دوبارہ زندہ ہو جائے...... جیسے میں اور تم...... اور ہماری محبت کی المناک کہانی......

پاکستان سے پڑھا ڈاکٹر فرید، ہرات سے بھاگا تو اس لیے تھا کہ دو بڑی طاقتوں کے نظریاتی ٹکراؤ نے اُن کی بستیوں کو خاک بسر کر دیا تھا۔ اور رزق کمانے کے آثار دُور دُور تک دکھائی نہ دیتے تھے۔ غیر ملکی دشمن فوجوں سے خوفزدہ اس کی ماں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے کہ وہ وہاں سے کسی طرح بھاگ نکلے...... کہ وہ ہزاروں دوسری ماؤں کی طرح اس کی نعش کو گود میں رکھ کر رونا نہیں چاہتی اور جب وہ گھر چھوڑ کر بدلیش جا رہا تھا تو اُس کے گھر کے آنگن میں قندھاری اناروں کے سُرخ پیڑوں پہ شگوفے پھوٹ رہے تھے - اور باداموں سے بھری ڈالیاں زمین کو چھو رہی تھیں...... روس کے ساتھ المناک ٹکراؤ کے بعد، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُس کے وطن کی گلیوں میں بہتی خون کی ندیاں، مغربیوں کی لالچ طمع اور زورآوری کا نتیجہ ہے، وہ امریکہ چلا گیا...... کیونکہ، اس امر سے بھی وہ بخوبی واقف تھا کہ کسی بڑے چھل کی وجہ سے اُن لوگوں نے کائنات کا سارا رزق اپنے بھڑولوں میں جمع کر لیا ہے...... اور جب اُن دُور دیشوں میں شب روز کی محنت سے اُسے وہاں کے مستند ڈاکٹروں کی صف میں کھڑا کر دیا تو اُس کی ماں چیخ اُٹھی...... اب کی بار جو بارود گر رہا ہے...... اُس نے زمین کی تہوں میں دفن مُردوں کی ہڈیاں بھی راکھ کر دی ہیں......

اپنے گھر کے آنگن میں جھولتے اناروں اور باداموں کے پیڑ اور ماں کی پلکوں پہ مسلسل جے آنسوؤں نے ڈاکٹر فرید کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ڈالر برساتے کاروبار کو بند کر کے بارڈروں پہ لگتے، افغان مہاجرین کیمپوں میں امدادی کام کے لیے روانہ ہو...... بارڈر کے بین بین خاردار مہاجر کیمپ میں، جس گھڑی ڈاکٹر فرید، آدھے جلے، ٹنڈ منڈ درد سے بلبلاتے، کراہتے موت کے لیے ترلے لیتے، زمین پر پڑے انسانوں کو ٹاپتا، خانم جان کی بوسیدہ جھگی میں پہنچا۔ حاملہ خانم جان کا بچہ اُس کی بچہ دانی سے آدھا باہر اور آدھا اندر لٹک رہا تھا...... مہاجرین کے جتھے کے ساتھ چلنے سے کچھ دیر پہلے، آسمان سے گرے اُس ایک بم نے جو زمین پر گرتے گرتے ایک نہیں رہتا، بلکہ ناگن کے سپولوں کی طرح سینکڑوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا پورا خاندان برباد کر دیا تھا...... اس لیے کارواں کے پیچھے گھسٹتی جب وہ مہاجر کیمپ پہنچی، تو ناف کے اندر محفوظ اُس کا منتوں سے مانگا بچہ آدھا مر چکا تھا......

ڈاکٹر فرید تو صرف یہ دیکھنے آیا تھا کہ مُردہ بچے کا زہر اس کی ماں کے بدن میں گھلا یا نہیں...... زلیخا کی بھی ایسی ہی تباہی کی کوئی المناک داستان تھی......

وہ خانم جان کے ٹینٹ میں اُس کی مصیبت میں ہاتھ بٹانے آئی تھی...... پھر ان دونوں کی نگاہیں اس دردناک لمحے میں دوچار ہوئیں...... وہ پل بھر کو ٹھٹکا...... آنکھوں کے ایسے گہرے پُر شور ساگر، اُس نے اس سے پہلے سات سمندر پار بھی نہیں دیکھے تھے...... اس کی آنکھیں بھید بھری تھیں...... جیسے اُن میں ازمنوں کے اسرار چھپے ہوں...... پل پل رنگ بدلتی، جھرنوں جیسی پُر شور...... ایک پل فرید کا سانس اس کے زخرے میں اٹک گیا...... وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا...... خانم جان کا بچہ تو مر گیا تھا، فرید کی

کاوش نے اُسے زندگی بخش دی تھی۔ لیکن ہوا یوں کہ آدھا چہرہ چھپانے والی حسن وجمیل زلیخا نے اُس سے کوئی ایک لفظ بھی نہ بولا...... فرید نے اُس سے کہا کہ تمھاری پُرشور نگاہوں نے میرے اندر طوفان برپا کر دیا ہے...... پھر بھی وہ وہاں خانم جان کے ارد گرد کھڑے ایک دوسرے کی لازوال محبت کی گرفتار ہو گئے...... اور اس واٹر لِلی سی بے گھر لڑکی نے جس گھڑی ڈاکٹر فرید کے دل پر قبضہ کیا وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ ان دونوں کا تعلق دو ایسے قبیلوں سے تھا جو نسلوں سے ایک دوسرے کے دشمن تھے...... اور اب خارجی جہاد دشمنوں کے بارود سے فنا فی اللہ ہو رہے تھے۔

زلیخا نے کیمپ کے اندر اپنے آپ کو صبح و شام زخمیوں اور لاوارثوں کی مدد کے لیے وقف کر رکھا تھا......

ڈاکٹر فرید دن میں سیکڑوں لوگوں کی زندگیاں بچاتا...... پر زلیخا کی آنکھوں کے سمندر اُسے جینے نہ دیتے وہ آتے جاتے اُس کی آنکھوں میں اُن شدید دُکھوں کو محسوس کرتا، جن سے وہ گزر رہی تھی...... پھر ایسے ہی فرید نے ایک ٹرمرائے زرد رو چاند کی روشنی میں، زلیخا کا ہاتھ تھام کر اُس سے کہا...... مجھ سے شادی کر لو...... ہماری محبت کا نُور، اِس بھوکے ننگے درد سے بلبلاتے ہجوم میں زندگی کی رمق پیدا کر سکتا ہے......

میں مانتی ہوں، میں تم سے شدید محبت کرتی ہوں...... لیکن میرے اندر نفرت کے شدید لاوے اُبلتے ہیں۔ شاید تمھاری محبت سے زیادہ دہکتے ہوئے...... میں ان سب اجارہ داروں، بے رحموں، قاتلوں سے بدلہ لینا چاہتی ہوں، جو ہماری بستیاں تباہ کر رہے ہیں......

میں انھیں قریب سے جان چکا ہوں۔ کبھی تم نے سُنا یا دیکھا کہ موتیے کی ننھی سی کلی، کسی بہت بڑے شیطان کو بھسم کرے۔ میرا لمس تمھیں میرے سچ کا یقین دلائے گا...... اور وہ اُس رات کیمپ کی فولادی تاروں کے سائے میں، خدا کو حاضر ناظر جان کر ایک دوسرے کی حیات کے شریک بن گئے تھے...... پھر اُسی رات وہ اپنے پھٹے پرانے خیمے میں ایک دوسرے کے بدنوں میں ضم ہوتے، ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ ازل سے ابد تک اُن کے وجود دراصل ایک تھے......

اور وہی وہ امٹ لمحہ تھا جب طاقتوروں، گورے دہشت گردوں نے فیصلہ کیا کہ زمین کے اس ہرے بھرے خطّے، میں انسانوں کے اس ہجوم کی مزید کوئی گنجائش نہیں...... اور ان میں سے کسی ایک نے جوہری توانائی کے تمام بٹن آن کر دیے...... اور ایٹم میں لپٹی موت نے وقت کی گردن پر اپنا فولادی پنجہ گاڑا اور وقت کو فنا کر دیا...... نہ کہیں کوئی ازل کا نشان باقی رہا، نہ ابد کا......

ایٹم برس جانے کے بعد کی اشد سردیوں اور کیچڑ بھری سیاہ بارشوں کے بہت برسوں بعد، کچھ باقی ماندہ گلے سڑے کوڑھی...... بیمار، جو نہ مُردہ تھے نہ زندہ بلکہ موت کی دعائیں مانگتے تھے...... مہاجر کیمپ کے ایک خیمے کے ننگے فرش پر ایک پرچھائیں دیکھتے تھے...... جیسے کسی نے اُس کی پرچھائیں کو وہاں بطورِ سند ہمیشہ کے لیے کندہ کر دیا ہو...... فرید اور زلیخا کے بدنوں کی پرچھائیں۔

☆☆☆☆☆

# محفوظ کیے گئے قدم

جن قدموں کو محفوظ کیا جاتا ہے وہ بڑے نصیب والے ہوتے ہیں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو وہ راستے بھی محفوظ ہو جاتے ہیں جن پہ وہ قدم چلا کرتے تھے۔ وہ مقام بھی سلامتی سے قائم کر لیے جاتے ہیں، جہاں وہ چنے ہوئے خوش نصیب قدم رُکا کرتے تھے۔

ایسے بخت آور قدموں کی تمام تر نشانیاں بتانا ہر ایک کے بس میں نہیں ہے۔

بڑی نشانی ایک ہے،

ایسے قدموں کی کہ، ایسے قدم، قدم اٹھانے والا اپنی مرضی سے نہیں اٹھاتا۔

جہاں اُسے لے جایا جاتا ہے وہ چلا جاتا ہے۔

جہاں رکنے کا اذن ملتا ہے وہ قدم روک لیتا ہے۔

کسی بھی راستے پہ اُسے بھیجا جائے وہ چل پڑتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ کتنا کٹھن راستہ ہے، نوکیلے پتھر ہیں، کانٹوں بھری جھاڑیاں ہیں۔ راہ میں سایہ ہے کہ نہیں۔ دھوپ راستوں میں پینے کو پانی بھی ملے گا یا نہیں۔

محفوظ ہونے والے قدم ایسی بحث میں نہیں پڑتے۔

انہیں اپنی عقل کی آنکھ سے زیادہ، بھیجے جانے والے کی نگہ پہ بھروسہ ہوتا ہے۔ ایسے قدم چلنے والا جانتا ہے کہ وہ جس کی ڈور پکڑ کے پتنگ بنا اڑے جا رہا ہے، وہ نہ اناڑی ہے نہ کمزور۔ ساری ہوائیں اس کے حکم سے چلتی ہیں۔ اُسے پتہ ہوتا ہے ساری زمینیں سانس لیتے ہوئے اس کا نام لیتی ہیں۔

وہ جانتا ہے کہ اس کے حکم کے بغیر زمین راستوں کو کوئی رستہ راہ نہیں دیتا۔ اسے یہ بھی خبر ہوتی ہے کہ جب اُسے راہ ملی ہوئی ہو، تو راہ کی کوئی بھی رکاوٹ، روک نہیں سکتی۔

ایسے نصیب آور قدم، قدم قدم چلتے ہوئے اپنی آنکھوں میں اس کی نگہ رکھ کے چلتے جاتے ہیں۔ فاصلہ دنوں کا ہو، مہینوں کا یا

ابدال بیلا

صدیوں کا، بھیجنے والے کے حکم سے سمٹتا جاتا ہے، لپٹتا رہتا ہے، محفوظ ہوا رہتا ہے۔
سیّدنا ابراھیمؑ نے بہت سفر کیے۔
ساری زندگی سفر میں گزاری
جہاں پل بھر کے لیے قدم روکنے کا حکم ملا، گھڑی دو گھڑی قیام کیا،
اسی مقام کو محفوظ کر لیا گیا۔
سخت پتھر کی چٹان کے سینے پہ ان کے بخت آور پاؤں آئے، تو وہ پتھر ادب سے دوہرا ہو کے ان کے پیروں میں سمٹ گیا۔ وہ پتھر جو اپنی نوکیلی پتھریلی سخت زبان سے پیروں کو چاٹنے کا عادی تھا، وہ ان کے بابرکت پیروں کے لمس سے مکھن کی ڈلی بن گیا۔ ان کے پیروں کا نشان اپنے دل پہ رکھ کے ہمیشہ کے لئے امر ہو گیا۔ اپنے جیسے ہزارہا پتھروں کے قبیلے سے نکل گیا۔
ممتاز ہو گیا۔
تقدس سے بھر گیا۔
ہر آنے والے وقت کی آنکھ میں کھب گیا۔
محفوظ ہو گیا۔
مگر ایسا ہونے سے پہلے بہت کچھ ہونا باقی تھا۔
یہ محفوظ کیا گیا پتھر تو خدا نے اپنے گھر کی چوکھٹ پہ سجانا تھا۔
سجا لیا۔
گھر کے بنانے والے مزدور کو کبھی کسی نے اتنی عزت دی ہے؟
وہ گھر عام گھر تھوڑی تھا۔
وہ عزت والے کا، عزت والا گھر ہے۔ جسے اس روئے زمین پہ اس کے نام کے لئے ہر سجدے کا رُخ ہونا تھا۔ جسے اس کے آخری لاڈلے رسولؐ کے لائے ہوئے دین کی پہچان بننا تھا۔ اس لیے ایسے عظمت والے گھر کو لاڈلے آخری رسولؐ کے گھر کے سامنے بننا تھا۔
کہنے کو خدا نے سیّدنا ابراھیمؑ اور ان کے فرزند سیّدنا اسماعیلؑ کو فرشتے بھیج کے، اپنے گھر کا نقشہ دکھایا تھا۔ حالانکہ اسی نقشے میں دو ہزار سال بعد اپنے لاڈلے رسولؐ آخر کا چلا جانے والا ایک ایک قدم اس لمحے بھی خدا کے روبرو تھا۔ خدا کے سامنے وقت کی تقسیم ہماری طرح نہیں ہے۔ ہمارے پاس تو وقت کی تین شکلیں ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ خدا کے سامنے یہ تینوں زمانے سر جھکائے ادب سے کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں کہ کب کس زمانے کو تعمیل کے لئے حکم ملے اور وہ چنا جائے۔
چنے ہوئے لوگوں کے لئے وقت کا بھی چناؤ ہوتا ہے۔
ہوا۔
مگر یونہی نہیں، ایک سے ایک بڑے امتحان سے گزارنے کے بعد۔ سب کو دکھا کے۔ منوا کے۔ تاکہ آنے والے وقتوں میں، انسان بڑے انعام کی جب بھی کوئی کسوٹی بنائے۔ معیار ایک ہی رہے۔
ایثار اور قربانی۔
قربانیوں کے کسی بھی پیرائے میں سیّدنا

ابراھیمؑ، سیّدنا اسماعیلؑ اور سیّدہ ہاجرہؑ نے عظیم ترین قربانیاں پیش کی۔ انہیں محفوظ کر لیا گیا۔ رائج کر دیا گیا۔ آنے والوں کو پیروی کا حکم دے دیا گیا۔

شیر خوار بچے اور وفا شعار بیوی کو چالیس دن اونٹ کی مسافت پہ ایک بنجر خشک پہاڑوں بیچ صحرا میں چھوڑا جانا، جہاں نہ پینے کے لئے ایک بوند پانی تھا نہ سائے کے لیے کوئی سبز پتہ۔ وہیں شیر خوار بچے کی ایڑھیوں سے میٹھے ٹھنڈے خوشگوار پانی کا چشمہ جاری ہونا تھا۔ ہوا۔ بنجر خشک صحرا کے سینے سے سبز کونپلیں نکل آئیں۔ وہ تین طرف سے آتے جاتے قافلوں کے راستے کا مقام اِتصال تھا۔ یمن سے آئے ایک قافلے نے سیّدنا ہاجرہؑ سے درخواست کی کہ ہم مسافر ہیں، تھکے ہوئے ہیں۔ اجازت ہو تو آپ کے چشمے کے پاس رک جائیں۔ اس بابرکت پانی سے اپنی اور اپنے جانوروں کی پیاس بجھائیں۔ سیّدنا ہاجرہؑ نے اجازت دے دی۔ یوں وہ قافلہ جو اپنی پہچان، بنو جرہم بتاتا تھا، وہاں رُک گیا۔ دھیرے دھیرے چشمے کے آس پاس انہوں نے اپنے خیمے لگا لیے۔

خیمے دھیرے دھیرے پتھروں کے گھروندے بن گئے۔

سیّدہ ہاجرہ کا شیر خوار سیّدنا اسماعیلؑ قدم قدم چلنے والا بچہ بن گیا۔

وقتے وقتے سے فلسطین کی طرف سے چالیس دنوں کی لمبی مسافت طے کر کے اونٹ سوار سیّدنا ابراھیمؑ اپنی بیوی اور بچے سے ملنے آتے اور رہتے۔ اللہ نے پیار باپ بیٹے میں ایسے ڈال دیا جیسے شہد میں مٹھاس۔ سیّدنا ابراھیمؑ بچے سے دور بھی رہتے تو اس کی محبت کی پھوار سے بھیگتے رہتے۔ بچہ بڑا ہوتا ہوتا اتنی عمر کو پہنچ گیا کہ وہ باپ کے آگے پیچھے دوڑنے لگا۔ کبھی سیّدنا ابراھیمؑ بھاگ کے اسے چاہ زمزم سے میٹھا پانی لالا پلاتے، کبھی وہ مٹی کا کٹورا پانی سے بھر کے باپ کے پیچھے پیچھے بھاگتا پھرتا۔ زمزم کے کنویں سے چالیس پچاس قدم پر وہ مقدس جگہ تھی، جہاں خدا نے اپنا گھر بنانا تھا۔ جو آسمان پہ بنے اس کے معزز گھر کا اس دھرتی سے تمام تر جڑی زمینوں کے مرکز پہ عکس تھا۔ جسے ابھی بننا تھا۔ اسے کئے جانے والے سجدوں کا رُخ ہونا تھا۔ اپنا گھر بنانے والوں کا امتحان ابھی باقی تھا۔ تاکہ یہ منوا لیا جائے، کہ یہ دونوں باپ بیٹا اس مقدس گھر کے پتھر رکھنے کے اہل ہیں۔

باپ نے ایک رات ایک عجیب خواب دیکھ لیا۔ جس کی بابت انہیں معلوم تھا وہ خدا کی طرف سے حکم ہے اور اس کی تعمیل لازم ہے۔ دس سال کا بیٹا، پانی کا بھرا کٹورا لئے پاس آیا تو باپ نے کٹورا چھوڑ کے اس کی بانہہ پکڑ لی۔ اسے گلے لگایا۔ اس کا ماتھا چوما۔ کٹورے کا سارا پانی اُسے پلا دیا اور پھر اُسے دونوں کندھوں سے پکڑ کے اس کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ،اطمینان سے اسے اپنا خواب سنانے لگا۔ کہنے لگا، بیٹا، میں نے دیکھا ہے، میں تجھے خدا کے نام پہ قربان کر رہا ہوں۔

دس سال کا بیٹا، خدا کے مقام اور باپ کے رتبے سے کس قدر شناسا ہو گا کہ اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ بولا،

ابا پھر سوچ کیا رہے ہیں،

حکم کی تعمیل کریں۔

میری گردن حاضر ہے۔

باپ بیٹے کو لے کر خدا کے بنائے جانے والے گھر کے مضاف کی طرف چل پڑا۔

شاید خدا کو اس عظیم قربانی کی آڑ میں اپنی عزت والے گھر کی حدود طے کرنا تھیں۔

جہاں باپ بیٹا جا کے رُکے وہی بنائے جانے والے گھر کی حد طے ہو گئی۔

منیٰ نام کے میدان میں جا کے باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹا دیا۔

پیچھے اکلوتے بیٹے کی صحرا نشیں ماں، سیّدہ ہاجرہؑ دوڑتی آئی۔

شیطان سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

اس نے تو انسان کی تخلیق کے دن سے خدا سے، خدا کے ہر بندے کی راہ میں بیٹھنے کی اجازت لی ہوئی تھی۔

خدا نے بھی اس پہ واضح کر دیا تھا، کہ تم اپنی کوشش کرتے رہنا مگر جو میرے بندے ہیں، ان پر تمہارا زور نہیں چلے گا۔

وہی ہوا۔

شیطان نے بھاگم بھاگ، باری باری تینوں عظیم ہستیوں کو ورغلانے کی کوشش کی۔

پہلے باپ کے کان میں خود کلامی کے انداز میں سوچنے لگا، شاید تجھے مغالطہ ہوا ہو۔ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میری پہچان ہے۔ میری نسل اس سے چلنی ہے۔ یہی قربان ہو گیا تو میں بے نشان رہ جاؤں گا۔ شاید اتنی باتیں شیطان کے منہ سے نہ نکلی ہوں کہ سیّدنا ابراہیمؑ جو آگ کے سمندر کو گلِ گلزار بنا کے آئے ہوئے تھے، کیسے امتحان کے پھولوں پہ آگ کا شک کرتے۔ زمین پہ جھک کے موٹی سی کنکری اٹھائی اور شیطان کے منہ پہ ماری۔

شیطان سر سے پاؤں تک کنکر بن کے جم گیا۔

مگر اس نے ہار نہ مانی۔

اگلا وار اس نے معصوم صاحب زادے پہ کیا۔

اس کے دل میں وسوسوں کا جال بنا کے شکار کرنے کی نیت سے قریب گیا۔ وسوسہ دل میں یہ ڈالا، کہ ذرا ہوش کرو۔ یہ کیا بات ہوئی، خواب باپ دیکھے اور چھری کے نیچے گردن تیری آئے۔ بھاگ جا۔

وہ بھی رسول زادہؑ تھا۔ خود نبیؑ تھا۔ باپ کا ہاتھ مزید زور سے پکڑ لیا۔ ہاتھ پکڑے پکڑے، چلتے چلتے جھک کے زمین سے باپ کے اٹھائے کنکر سے بھی بڑا کنکر اٹھایا اور وسوسوں کی کھسر پھسر کرتے شیطان کے ماتھے پہ کھینچ مارا۔

شیطان پھر تلملانے لگا۔

اب اس نے تیسری بار حملہ آور ہونے کا پروگرام بنایا۔

اُسے شاید پتہ تھا کہ امتحان میں کامیابی کی صورت میں، انہی دونوں کے ہاتھوں خدا کا عزت والا گھر بنے گا اور اُسی گھر کے پڑوس سے، انہی کی نسل سے ایک ایسے برگزیدہ رسولؐ آخر کی بعثت ہوگی، جس سے اس نسل انسانی کو بھٹکانے کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ اُسے آنے والوں وقتوں میں اپنی حیثیت برباد ہوتی نظر آ رہی تھی۔ وہ کیوں نہ ہاتھ پاؤں مارتا۔ اس نے سوچا، پہلے پہل آدم جب اُس کے ہاتھوں نہ پھسلا تو اماں حوا نے اس کی کھسر پھسر پہ کان دھر لیے تھے۔

کیا پتہ بی بی ہاجرہؑ بھی حوا کی طرح ہو؟

تیسری بار اس نے دونوں باپ بیٹا کے پیچھے ممتا کے تھکے پاؤں بھگا دیئے۔ سیّدہ ہاجرہؑ کے ذہن میں سرگوشیاں شروع کر دیں۔ یہ کیا انہونی ہوئی۔ بیٹا پیدا ہوا تو چالیس دن اونٹ کے سفر پہ اس ویرانے میں لا چھوڑا۔ اب بیٹا جوان ہونے لگا تو اُسے زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکالا جا رہا ہے۔ بھاگ کے جا۔ روک لے۔ اپنے بیٹے کو بچا۔ سیّدہ ہاجرہؑ جلیل القدر نبی کی زوجہ تھیں، عظیم الشان نبی کی والدہ تھیں۔ انہیں اپنے اکلوتے بیٹے کے ماتھے پہ اس جہاں کے عظیم ترین رسولؐ کے جدِ امجد ہونے کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ ان عظیم باپ بیٹا اور ان کے خدا کے رازو نیاز میں کیسے دخل دیتیں۔

وہ بھی جھکیں۔

ایک بہت موٹا کنکر اٹھایا۔ اور اس کی کنپٹی پہ مارا۔

تیسری بار شیطان پھر پتھر بن گیا۔

راہ کے سارے کانٹے نکل گئے۔

بیٹا سرشاری تعمیل میں سر جھکائے، آنکھیں میچے چٹان پہ گردن رکھ کے لیٹ گیا۔

باپ نے آسمان دیکھ کے خدا کو گواہ بنایا اور چھری بیٹے کی گردن پہ رکھ دی۔

ممتا نے دور قدم روک کے نگاہیں اوپر اٹھا کے اپنی روح سجدے میں رکھ دی۔

آسمان سے زمین تک نور کی قندیل جلی۔

آواز آئی۔

ابراہیمؑ تیری قربانی ہمیں پہنچ گئی۔

تو نے خواب سچ کر دکھایا۔

ہم نے تیرا بیٹا ایک مقدس قربانی سے بدل دیا۔

دیکھ

آنکھیں کھول

سیّدنا ابراہیمؑ نے آنکھوں پہ باندھی پٹی کھولی، تو دیکھا، سامنے ان کے فرزند سیّدنا اسماعیلؑ سلامت کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اور قربان گاہ پہ ایک مینڈھا قربان ہوا پڑا تھا۔

آواز آئی

یہ مبارک قربانی کا مبارک بدل ہے۔

اصل بڑی قربانی کا بہتر بدل اسی لمحے اسی فرماں بردار جلیل القدر صاحب زادے کی نسل سے پیدا ہونے والے سیّدنا ابراہیمؑ کی دعا رسولِ آخر کے متبرک گھرانے کے نام

لکھا گیا۔
ورنہ کوئی مینڈھا ایک رسولؑ سے کیسے برتر اور بہتر ہو سکتا تھا۔
وہ تو فرماں برداری کا انعام تھا۔ کھانے کی ضیافت تھی۔
کہا۔
اسے کھاؤ۔ کھلاؤ۔
تم باپ بیٹا اور ماں اس آزمائش میں پورے اترے۔
مکہ کی بستی، دھیرے دھیرے بڑھتی رہی۔
سیدنا ابراھیمؑ دور سیدہ سارہؓ کے گھر سے کندھے پہ تیر کمان ڈالے اونٹ پہ بیٹھ کے آتے جاتے رہتے۔ ایک بار واپس گئے، تو انہوں نے سیدہ سارہؓ کو خدا کی طرف سے ملی ایک خبر سنائی۔ سیدہ سارہؓ کے بیٹے سیدنا اسحاقؑ اور اسحاق کے بیٹے یعقوبؑ کی خوشخبری دی۔ پھر پلٹ کہ مکہ آئے تو سیدنا اسماعیلؑ کو تیراندازی کے سبق دیئے۔
اسی ملاقات میں شاید، جب سیدنا اسماعیلؑ کی عمر بیس سال کی تھی تو سیدہ ہاجرہؓ کے جانے کا وقت آ گیا۔ وہ جس جھونپڑی میں رہتے تھیں، وہیں باپ بیٹا نے انہیں دفنا دیا۔ یہ تو بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ خدا نے اپنے گھر کی بنیادوں کی نشان دہی کرتے وقت سیدہ ہاجرہؓ کی قبر کو کعبہ کی شمالی دیوار میں داخل کر لیا ہے۔
جواب حطیم ہے۔
باپ بیٹے کی آخری ملاقات، تعمیر کعبہ پہ ہوئی۔
بیٹا تیس سال کا ہو چکا تھا۔ باپ کی عمر ایک سو بیس سال کے لگ بھگ تھی۔
اس ملاقات سے پہلے دو بار سیدنا ابراھیمؑ بیٹے سے ملنے اس کی جھونپڑی پہ آئے تھے۔ دونوں بار بیٹا تیر کمان لے کر کہیں دور گیا ہوا تھا۔
پہلی دفعہ باپ نے بیٹے کی دہلیز پہ دستک دی تو اندر سے ایک ناشکری عورت کی آواز آئی جو دہلیز سے باہر نکل کے اپنے خاوند کی شکایتیں کرنے لگی۔
کیا بتاؤں، کدھر گیا ہے۔
کبھی بتا کے گیا ہی نہیں۔
اس اجاڑ میں قید کر کے رکھا ہے۔
اوپر سے آپ آ گئے ہیں پوچھنے، کیا بتاؤں؟
بڑبڑ کرتی ہوئی وہ واپس دہلیز کے اندر جانے لگی تو سیدنا ابراھیمؑ نے اسے پل پھر کے لئے روکا۔
بولے،
تیرا خاوند آئے تو میرا ایک سندیسہ دے دو گی؟
وہ ناک چڑھا کے بولی، بولیں۔
سیدنا ابراھیمؑ کہنے لگے، کہنا گھر کی دہلیز بدلنے والی ہے۔ بدل لے۔
کہہ دوں گی، مگر اس نے میری کہی تھوڑی سننی ہے۔ یہی دیمک زدہ دہلیز میرے نصیب میں لکھی ہے۔
سیدنا ابراھیمؑ مسکرائے اور واپس پلٹ گئے۔
سیدنا اسماعیلؑ اپنے گھر پہنچے۔
پوچھنے لگے، کوئی ملاقاتی آیا تھا کیا؟ (شاید

باپ کی خوشبو نے ان کے ذہن میں سوال اتارا ہو)

سیّدنا اسماعیلؑ کی بیوی نے الٹے سیدھے ہاتھ ہلا کے انہیں ایک روشن چمکتی آنکھوں والے سفید ریش بوڑھے کی آمد کا بتایا اور کہنے لگی، عجیب سا سندیسہ دے کے گیا ہے وہ بابا۔ جاتے جاتے کہنے لگا، تیرا خاوند آئے تو کہنا، گھر کی دہلیز بدل لے۔ تو نے تھوڑی اسے بدلنا ہے۔ وہ کہہ ایسے رہا تھا کہ جیسے تو واقعی اس کی بات مان لے گا۔

ہاں، مان رہا ہوں۔

وہ بزرگ ٹھیک کہہ رہے تھے۔

انہیں پتہ ہے جو وہ کہتے ہیں میں وہی کرتا ہوں۔

جانتی ہو وہ بزرگ کون تھے؟

مجھے کیا پتہ!

مجھے پتہ ہے۔

کون تھے؟

وہ میرے والد تھے۔ وہ اشارہ دے گئے ہیں کہ میں تمہیں بدل دوں۔ اس لئے تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ سیّدنا اسماعیلؑ نے دوسری شادی بھی اسی قبیلے بنو جرہم میں کی۔ دوسری بیوی شکر گزار تھی۔

ایک بار پھر سیّدنا اسماعیلؑ کی عدم موجودگی میں سیّدنا ابراہیمؑ اُدھر آئے۔ دستک دی۔

سیّدنا اسماعیلؑ کی دوسری زوجہ نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ پہچانی وہ بھی نہ کہ کون اس کے دروازے پہ وارد ہوئے ہیں۔ بس ان کے چہرے پہ پڑے منوں نور اور جسموں جاں کے عجیب مقدس وقار کو دیکھ کے خوش ہو گئی۔

آؤ بھگت کرنے لگیں۔

سائے میں بچھونا بچھایا۔

زم زم پلایا۔

کھانا کھلایا،

اونٹنی کو چارا دیا۔

سیّدنا ابراہیمؑ نے اس سے اس کے خاوند کی بابت پوچھا۔ وہ بڑے احترام سے بولی، گھر کے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ شاید آنے میں دیر ہو جائے۔ سیّدنا ابراہیمؑ خوش ہوئے۔ بولے، تیرا خاوند آئے تو اُسے میرا ایک پیغام دو گی؟

جی ضرور۔

کہنا، تیرے گھر کی دہلیز بہت اچھی ہے، اس کا خیال رکھنا۔

یہ کہہ کے سیّدنا ابراہیمؑ پھر پلٹ گئے۔

سیّدنا اسماعیلؑ نے اپنی زوجہ سے جب باپ کا پیغام سنا تو اُس کا ماتھا چومنے لگے۔ بولے، میرے ابا تھے وہ۔ تم سے خوش ہو کے گئے ہیں اور مجھے پیغام دیا ہے کہ میں تیرا خیال رکھا کروں۔

دونوں میاں بیوی کا پیار بڑھ گیا۔

اُسی بیوی سے سیّدنا اسماعیلؑ کے بارہ بیٹے پیدا ہوئے۔

بارہ بیٹوں سے بارہ قبیلے بنے۔

صحرا عرب میں ساری عرب نسل انہی سے بنی، مگر ابھی ایک عظیم ترین گھر بننا تھا۔

اسے بنانے کا حکم نامہ آ گیا۔
سیّدنا ابراھیمؑ پہنچ گئے - آگے آگے جبرائیلؑ قدم قدم چلے۔ سیّدنا اسماعیلؑ کی جھونپڑی کے برابر، زم زم کنویں سے چالیس گز کی دوری پہ خدا نے اپنے فرشتے کے ذریعے اپنے گھر کا نقشہ زمین پہ کھول دیا۔ صحرا میدان میں اونچے نیچے پتھروں کے بیچ جہاں جہاں دیواریں ابھرنا تھیں، وہاں سے ہوا اڑی، پہلے اس ہوا نے بنے جانے والے گھر کا طواف کیا۔ پھر جہاں سے اُڑی تھی وہ جگہ باقی جگہوں سے علیحدہ کر دی۔ زمین پہ کسی غیر مرئی انگلی سے کھدا ہوا نقشہ اُبھر آیا۔ چوکور سا کمرے کا نقشہ قدرے مستطیل مگر چاروں دیواریں ایسی کہ کوئی ایک دیوار سامنے کی دیوار کے برابر نہ تھی۔
''یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراھیمؑ کے لیے اس گھر کی جگہ تجویز کی تھی۔'' (قرآن، سورۃ الحج آیت ۲۶)
باپ بیٹا، خدا کے اس عظیم گھر کو بنانے میں جت گئے جسے قیامت تک خدا کو کیے تمام تر سجدوں کا رُخ ہونا تھا۔ کہتے ہیں تعمیر کعبہ کے لئے خدا نے دنیا کے پانچوں برگزیدہ پہاڑوں کے پتھر انہیں دستیاب کئے۔ ان میں طور کے پتھر بھی تھے، سینا کے بھی، حرا کے بھی، شیر اور لبنان کے بھی۔ بنیادوں میں اونٹ کی کہان کے مشابہ بڑے بڑے سبز پتھر تھے۔ جو اس میں یوں جوڑے گئے جیسے دو ہاتھوں کی انگلیاں جوڑ کے ہاتھوں کو سیکجا کیا جاتا ہے۔ تعمیر کے باقی پتھر مقامی پہاڑ ابوقبیس کے تھے۔
ابوقبیس پہاڑ کو امانت دار پہاڑ کہا جاتا ہے۔ کہنے کو ابوقبیس کا نام شاید اس لیے پڑا کہ ایک قبیس نامی شخص نے یہاں ڈیرہ لگا لیا تھا مگر امانت دار پہاڑ اس لئے کہا گیا کہ اس پہاڑ نے فرشتوں کا لایا ہوا جنت سے اتارا مقدس پتھر ''حجر اسود'' اپنی گود میں لئے رکھا۔ اور جب اس کی ضرورت ہوئی تو اسے سیّدنا ابراھیمؑ کے سپرد کر دیا۔ اسی امانت دار پہاڑ کی اوٹ سے کائنات کے سب سے بڑے امانت دار نے پیدا ہو کے امانت کا درس دینا تھا۔
سیّدنا ابراھیمؑ نے بیٹے کو بھیجا تھا کہ کوئی خاص پتھر لاؤ، جسے میں خدا کے گھر کے ایک کونے پہ ایسے لگاؤں کہ یہ لوگ اُس سے، اس گھر کا طواف شروع کریں۔ اور وہ خدا کے گھر کے ماتھے کا جھومر ہو۔
کونے پہ لگا خوب سجے۔
سیّدنا اسماعیلؑ کافی دیر پہاڑوں پہ ایسا کوئی خاص پتھر ڈھونڈتے رہے۔ واپس آئے تو دیکھا، سیّدنا ابراھیمؑ ہاتھ میں بلور کی طرح چمکتا ہوا ''حجر اسود'' لئے خوشی سے جھوم رہے ہیں۔ بیٹے کو آتا دیکھ کے بولے،
دیکھ یہ پتھر اس نے بھجوایا ہے جو مجھے کسی کا اپنے سوا محتاج نہیں رکھتا۔
یہ پتھر انوکھا ہے اور بڑا مقدس۔
ہر زائر نے یہاں آ کے پہلے اسے چومنا ہے یا اس کی سیدھ میں اسے چومنے کا اشارہ

کرتے ہوئے ادب سے سلام کر کے، اس گھر کا طواف شروع کرنا ہے۔ دیکھ، کتنا بلوری سفید ہے۔ اس کی سفیدی کے بارے میں لگتا ہے کہ یہ میلے من کے زائرین کے میل سے سیاہ نہ ہو جائے، لوگوں کے دلوں کی سیاہی جذب نہ کر لے۔

آؤ اسے مل کر لگائیں۔

شاید دونوں باپ بیٹا کو علم ہو کہ کبھی ہزاروں سال بعد اسی گھر میں یہ پتھر انہیں کی آل سے آئے رسولِ آخر کے ہاتھوں سے لگے گا۔ سجے گا۔

خدا کا پہلا گھر بن گیا۔ سادہ اور پُر وقار۔

گڑھے، ان گڑھ، بڑے، چھوٹے پتھروں کی چار دیواروں کا قدرے مستطیل کمرہ، جس پہ چھت نہیں تھی۔ دیواریں بھی عام انسانی قد سے کوئی ڈیڑھ ہاتھ اونچی۔ آٹھ، نو فٹ کے لگ بھگ۔ دروازے دو تھے۔ ایک مشرقی دروازہ جو اب بھی موجود ہے۔ دوسرا مغربی طرف۔ ایک اندر جانے کے لئے، دوسرا باہر آنے کے لیے۔

اندر جانے کا دروازہ اب رہ گیا،

باہر نکلنے کا دروازہ آخری رسولؐ کے آنے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

دروازوں کی چوکھٹ بھی نیچی تھی اس وقت۔ زمین کے برابر۔ چوکھٹ پہ کوئی پٹ نہیں، نہ کوئی تختہ نہ کوئی تختی، نہ ہی کوئی پردہ۔ چوپٹ کھلا ہوا گھر بنایا گیا میرے اللہ کا۔ کہا یہ گیا کہ یہ تمہارا گھر ہے سلامتی والا۔ اسے نماز پڑھنے، اعتکاف بیٹھنے، طواف کرنے اور حج کرنے والوں کے لئے صاف ستھرا رکھو۔

حج کے جو ارکان بتائے گئے، وہ تو سارے خانوادہ سیّدنا ابراہیمؑ کے ذاتی یا گھریلو زندگی کے آسودہ نشان تھے۔

خانہ کعبہ کی دیوار سے چالیس قدم پہ زم زم کا کنواں تھا (آج کل کے پیمانے سے ۲۱ میٹر ہوا)۔ جس کا ٹھنڈا میٹھا پانی طواف کے بعد پیٹ بھر کے پیتا تھا۔ جو فاقہ زدہ کے لئے کھانا اور پیٹ بھرنے والے کے لئے شفاء ہے۔ زم زم اور خانہ کعبہ کے درمیان، مقام ابراھیمؑ ہے۔ وہ آسمانی یاقوت جن پہ سیّدنا ابراھیمؑ کے پیروں کے نشان کھبے ہوئے ہیں۔ انگلی انگلی بھر گہرے۔ ایک پہ ۹ سینٹی میٹر اور دوسرے پہ ۱۰ سینٹی میٹر دبے ہوئے۔ سیّدنا ابراہیم کعبے کی تعمیر میں مشغول تھے اور خدا ان کے پیروں کے عکس محفوظ کر رہا تھا۔ کہتے ہیں جب سیّدنا ابراہیمؑ اوپر اٹھتے تو وہ پتھر بھی انہیں لئے لئے اوپر اٹھ جاتا۔

نیچے ہوتے تو وہ نیچے دب جاتا۔

وہ پتھر محفوظ کر لیا گیا۔

اُسے ایک دن اُس رسولِ پاک کا مصلاّ بننا تھا، جنہوں نے ان کی نسل سے ہوتے ہوئے انبیاء کی آخری مہر بننا تھا۔

یہ دیوار کعبہ سے اب کوئی 14 میٹر کے فاصلے پہ ہے۔

یہاں یا اس کے قرب وجوار میں نماز پڑھنے

کا حکم ہے۔
خانہ کعبہ، مقام ابراھیمؑ، زم زم کے بعد ارکان حج یا عمرے کے رکن دیکھیں۔
صفا اور مروہ کے درمیان چلنا۔
کیوں؟
اس لئے کہ سیّدہ ہاجرہؑ وہاں چلی تھیں۔
دونوں پہاڑیوں بیچ بھاگتی مقدس ممتا کو جب بیٹا نظر نہ آتا بھاگنے لگتیں۔ اب بھی یہی حکم ہے کہ ان جگہوں پہ رفتار تیز کر دو۔ صفا سے شروع کر کے مروہ پہاڑی تک سات بار سیّدہ بھاگی تھیں۔ سات بار ہر زائر بھاگے۔ بات تو ساری واحدنیت کی ہے۔ کوئی نہیں ہی جو اللہ کی بادشاہی میں شامل ہو۔ ہاں شاہی تخت کے گرداگرد جو بھی خاص واقعے ہوئے، خدا نے انہیں محفوظ کر لیا، اور بار بار لوگوں کو ویسا ہی کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ نہیں کہا، اس شخصیت کی شکل کا بت بنا کے اس کے گلے میں ہار ڈال دو۔
اس کے نام کے نعرے لگاؤ۔
شور مچاؤ۔ نا۔
کہا جو میری اس پیاری ہستی نے عمل کیا، تم بھی کرو۔
کعبۃ اللہ سے ۱۳۰ میٹر کے فاصلے پہ صفا کی پہاڑی ہے۔ یہاں سے محبت نباہنے کی کوشش شروع کرنا پڑتی ہے۔ کوشش ہی کو ''سعی'' کہتے ہیں۔ دونوں پہاڑیوں کے بیچ پہلے کی جو پتھریلی خاردار جگہ ہوتی تھی، اسے مسعی کہتے تھے۔ اب بھی کہتے ہیں۔ اب وہ آرام دہ محلاتی راستہ ہے۔ فاصلہ اب بھی اتنا ہی ہے۔ صفا اور مروہ بیچ تقریباً چار سو گز (۳۹۴.۵ میٹر) کا فاصلہ ہے۔ سات دفعہ یہ راستہ چلنا پڑتا ہے۔ ساتوں چکر ناپیں تو کوئی تین کلومیٹر کا فاصلہ بنتا ہے۔
پونے دو میل کے لگ بھگ۔
صفا اور مروہ اسی خانوادے کی نشانیاں۔
مروہ پہ سیّدہ ہاجرہؑ کو خوشگوار پاکیزہ میٹھے پانی کی خوشخبری ملی۔ اور صفا پہ آنے والے وقتوں میں سچے پاکیزہ ترین امانت دار رسول آخر سے میٹھے، پاکیزہ اور خوشگوار پیغام اسلام ملنا تھا۔
ملا۔
بات اسی خانوادے میں رہی۔
اپنے گھر کی ایک ایک اینٹ اس خانوادے سے لگوائی اور پھر چاروں اطراف اپنے حرم کی حدود جب طے کرائیں تو پھر اسی گھرانے کی باتوں کو ساری انسانیت کے رستوں کے نشان بنا دیا۔
منیٰ کی قربانی اور شیطان کے بہکاوے پہ کنکر۔
عرفات کا مقام۔
حرم کی ایک طرف سے حد طے ہوگئی۔
مشرقی حد۔
آج کی پیمائش سے خانہ کعبہ سے بائیس کلومیٹر دور، حجر اسود کی عین سیدھ میں ہے۔
باقی اطراف سے بھی حدود کا تعین ہونا تھا۔
ہوا۔

☆☆☆☆☆

# حاطبؓ بن ابی بلتعہ

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم نے میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمھارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں۔ اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب، اللہ پر ایمان لائے ہو۔ تم چھپا کر ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو، ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں۔ جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے وہ یقیناً راہِ راست سے بھٹک گیا۔ ان کا رویہ تو یہ ہے کہ اگر تم پر قابو پا جائیں تو تمھارے ساتھ دشمنی کریں اور ہاتھ اور زبان سے تمھیں آزار دیں۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ۔ قیامت کے دن نہ تمھاری رشتہ داریاں کسی کام آئیں گی نہ تمھاری اولاد۔ اس روز اللہ تمھارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور وہی تمھارے اعمال دیکھنے والا ہے۔'' (60:1 تا 3)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ نے غضب فرمایا، جو آخرت میں اسی طرح مایوس ہیں، جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر مایوس ہیں۔'' (60: 13)

قرآن کی سورۃ الممتحنہ کی ان آیات کا نزول اس وقت ہوا جب مشرکین مکہ کے نام حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا خط پکڑا گیا۔ قصہ یہ ہے کہ جب قریش کے لوگوں نے صلح حدیبیہ کا معاہدہ توڑ دیا تو رسول اللہؐ نے مکہ پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں مگر چند مخصوص صحابہ کے سوا کسی کو یہ نہ بتایا کہ آپ کس مہم پر جانا چاہتے ہیں۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مکہ سے ایک عورت آئی جو پہلے بنی عبدالمطلب کی لونڈی تھی اور پھر آزاد ہو کر گانے بجانے کا کام کرتی تھی۔ اس نے آ کر حضورؐ سے اپنی تنگدستی کی شکایت کر کے

پیروز بخت قاضی

مالی مدد مانگی۔ آپ نے بنی عبدالمطلب سے اپیل کر کے اس کی حاجت پوری کر دی۔ جب وہ مکہ جانے لگی تو حضرت حاطبؓ اس سے ملے اور اس کو چپکے سے ایک خط بعض سردارانِ مکہ کے نام دیا اور اسے دس دینار دیے تاکہ وہ راز فاش نہ کرے اور یہ خط چھپا کر ان لوگوں تک پہنچا دے۔ ابھی وہ مدینہ سے روانہ ہی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نبیؐ کو اس پر مطلع فرما دیا۔ آپ نے فوراً حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقداد بن اسودؓ کو اس کے پیچھے بھیجا اور حکم دیا کہ تیزی سے جاؤ، روضۂ خاخ کے مقام پر مدینہ سے 12 میل بجانب مکہ تم کو ایک عورت ملے گی جس کے پاس مشرکین کے نام حاطب کا ایک خط ہے۔ جس طرح بھی ہو اس سے وہ خط حاصل کرو۔ اگر وہ دے دے تو اسے چھوڑ دینا۔ نہ دے تو اس کو قتل کر دینا۔ جب یہ حضرات وہاں پہنچے تو وہ عورت اس مقام پر موجود تھی۔ انھوں نے اس سے خط مانگا۔ اس نے کہا میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ انھوں نے تلاشی لی لیکن کوئی خط نہ ملا۔ آخر انھوں نے کہا کہ خط ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم برہنہ کر کے تیری تلاشی لیں گے۔ جب بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے اپنی چوٹی سے وہ خط نکال کر انھیں دے دیا اور یہ وہ خط حضورؐ کی خدمت میں لے آئے۔ کھول کر پڑھا گیا تو اس میں قریش کے لوگوں کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ رسول اللہ تم پر چڑھائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے حاطب سے پوچھا یہ کیا حرکت ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ آپ میرے معاملہ میں جلدی نہ کریں۔ میں نے جو کچھ کیا اس بنا پر نہیں کی کہ میں کافر و مرتد ہو گیا ہوں اور اسلام کے بعد اب کفر کو پسند کرنے لگا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے اقربا مکہ میں مقیم ہیں۔ میں قبیلہ قریش کا آدمی نہیں ہوں بلکہ بعض قریشیوں کی سرپرستی میں وہاں آباد ہوں۔ مہاجرین میں سے دوسرے جن لوگوں کے اہل و عیال مکہ میں ہیں ان کو تو ان کا قبیلہ بچا لے گا مگر میرا کوئی قبیلہ وہاں نہیں ہے۔ اس لیے میں نے یہ خط اس خیال سے لکھا ہے کہ قریش والوں پر میرا ایک احسان رہے تاکہ وہ میرے بال بچوں کو نہ چھیڑیں۔ حاطب کے بچے اور بھائی اور ماں مکہ میں تھے۔ حاطب کی بات سن کر حضور نے حاضرین کو بتایا کہ حاطب نے تم سے سچی بات کہی ہے یعنی ان کے اس فعل کا یہی محرک تھا۔ حضرت عمر نے اُٹھ کر کہا یا رسول اللہ مجھے اجازت دیں میں اس منافق کی گردن مار دوں۔ اس نے اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے۔ حضور نے

فرمایا اس شخص نے جنگ بدر میں حصہ لیا ہے اور ہوسکتا اللہ نے اہلِ بدر کو معاف کر دیا ہو۔ یہ سن کر حضرت عمر رو دیئے اور کہا کہ اللہ کے رسول ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ بہت سی روایات میں سے کسی روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ حضرت حاطبؓ کا یہ عذر سُن کر انھیں معاف کر دیا گیا یا انھیں کوئی سزا دی گئی۔ اس لیے یہی سمجھا گیا کہ ان کا عذر قبول کر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔

اس سورۃ کے نزول کا باعث اگرچہ یہی واقعہ بن لیکن اللہ تعالیٰ نے تمام اہلِ ایمان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ درس دیا ہے کہ کفر و اسلام کا جہاں مقابلہ ہو اور جہاں کچھ لوگ اہلِ ایمان کے مسلمان ہونے کی بنا پر دشمنی کر رہے ہوں، وہاں کسی شخص کا کسی غرض اور کسی مصلحت سے بھی کوئی ایسا کام کرنا جس سے اسلام کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہو اور کفر و کفار کے مفاد کی خدمت ہوتی ہو، ایمان کے منافی حرکت ہے اور یہ کام کرنے والا راہِ راست سے بھٹک گیا۔ یہ اشارہ ہے حضرت حاطب کی طرف۔ انھوں نے اپنی ماں، بھائی اور اپنی اولاد کو جنگ کے موقع پر دشمنوں کی ایذا سے بچانے کے لیے یہ کام کیا تھا اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے جن کی خاطر اتنے بڑے قصور کا ارتکاب کر ڈالا وہ قیامت کے روز تمھیں بچانے کے لیے نہیں آئیں گے۔ اس وقت ہر ایک کو اپنی ہی پڑی ہوگی۔

صلح حدیبیہ سے فارغ ہونے کے بعد رسولؐ اللہ نے جو خطوط اطراف و نواح کے بادشاہوں کو بھیجے تھے ان میں سے ایک اسکندریہ کے رومی بطریق (Patriarch) کے نام بھی تھا جسے عرب مُقَوقس کہتے تھے۔ حضور نے یہ نامہ گرامی حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کے ہاتھ بھیجا تھا اس نے اسلام تو قبول نہ کیا، مگر ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا اور جواب میں لکھا کہ ''مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک نبی آنا ابھی باقی ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ وہ شام میں نکلے گا۔ تاہم میں آپ کے ایلچی کے ساتھ احترام سے پیش آیا ہوں اور آپ کی خدمت میں دو لڑکیاں بھیج رہا ہوں جو قبطیوں میں بڑا مرتبہ رکھتی ہیں۔'' ان لڑکیوں میں سے ایک سیرین تھیں اور دوسری ماریہ۔ مصر سے واپسی پر راستہ میں حضرت حاطبؓ نے دونوں کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ ایمان لے آئیں۔ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے سیرین کو حضرت حسانؓ بن ثابت کو ملک یمین میں دے دیا اور اور حضرت ماریہؓ کو اپنے حرم میں داخل فرمایا۔ ذی الحجہ سن 8 ھ میں انہی کے بطن سے حضورؐ کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے۔

☆☆☆☆☆

# دعا ردِ بلا ہے

ماں باپ کی فطرت میں ہوتا ہے صدقے واری جانا، جب دیکھو محبت چھلک چھلک پڑتی ہے۔ سر پہ ہاتھ پھیرنا، ماتھا چومنا، مشکل ترین حالات میں ہاتھ اپنے شفیق ہاتھوں میں لے کر سب ٹھیک ہو جانے کی بشارت اور لمس کی حرارت دینا۔ گویا سب ٹھیک ہو ہی جائے گا۔

لیکن یہ کیسی خبر ہے کہ وبا پھوٹ پڑی ہے۔ شمال سے جنوب تک مشرق سے مغرب تک ایک ہی صدا ہے کہ ''فاصلہ رکھو'' ''کسی سے ہاتھ نہ ملاؤ'' اور تو اور یہ بھی سننے میں آیا کہ بڑی عمر کے لوگوں پر یہ وائرس جلد اثر کرے گا۔ وہ اس کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ مطلب اب کوئی کسی سے مہر و مروت سے پیش نہیں آئے گا؟ اور رر سب بوڑھے مر جائیں گے؟ ایسے کیسے چلے گی دنیا؟ بچوں کے سر پہ ہاتھ کون رکھے گا؟ دعا کون دے گا''

شفیق احمد نے اٹھ کر ٹی وی کا سوئچ نکال دیا اور کمرے میں ادھر سے ادھر گھومتے وہ مسلسل سوچ رہے تھے ''اب کیا کروں۔ باہر نہ نکلوں، بچوں سے اپنے نحیف وجود کو دور رکھوں..... کہیں میری وجہ سے..... نہیں نہیں۔ میں اپنے کمرے میں ہی رہوں گا۔ وہ یاد کرنے لگے وبائیں کب کب پھوٹیں اور کیا کیا تباہیاں کیں۔ ذرا ذہن پہ زور ڈالا تو دل خوف کی گرفت میں آ گیا۔ وبائیں تو گھروں کے گھر ویران کرتی ہیں۔ کسی کا شوہر، کسی کی بیوی، کہیں بچے، کہیں بہن بھائی۔

بات یہاں تک ہوتی تو بھی عقل ساتھ دیتی لیکن اس طرح کی فضا میں تو نفسانفسی پھیل جاتی ہے۔ سب خود کو بچاتے ہیں، ہر کوئی اپنے آپ میں سمٹ جاتا اور تو اور کوئی کسی کے جنازے میں نہیں جاتا۔

''اوئے شفیق احمد پاگل ہو گیا ہے۔ جنازہ تو ہوتا ہی نہیں۔ سنا ہے شہر سے دور ایک گڑھا کھود دیتے ہیں۔ لاشوں کو تعفن زدہ کوڑے کرکٹ کی طرح اونچائی سے گڑھے میں انڈیل دیا جاتا ہے۔ یا جلا دیا جاتا ہے۔'' اپنی ہی بڑبڑاہٹ سے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک دم انہیں احساس ہوا وہ بھی تو صرف اپنے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ کمرے سے نہیں نکلیں گے تو اپنے پیاروں

ثمینہ سیّد

کو کیسے سمجھائیں گے، کیسے سنبھالیں گے؟

''اس گھر میں تو کوئی ایک فرد بھی گھر میں رہنے کا عادی نہیں ہے۔ نعیم میاں خود تو صبح کے گئے شام کو لوٹتے ہیں پھر رات گئے تک دوست آ رہے ہیں، کھانے پینے بھی باہر سے چل رہے ہیں یا پھر یہ خود کہیں مدعو ہیں۔ بہو بیگم کھانے، پینے، پہننے اور تو اور رشتہ داروں کو لین دین تک کی ذمہ داریاں خود سنبھالتی ہیں۔ بیٹے، بیٹیاں ہر وقت آ جا رہے ہوتے ہیں ایسے لگتا ہے بس تیار ہونے ہی گھر آتے ہیں۔ ان کے تو کتے، بلیاں بھی گھر میں نہیں ٹکتے۔ یہ کیسے وقت میں پھوٹ پڑی وبا... اوہ میرے اللہ! کیسے بچاؤں سب کو۔''

شفیق احمد انہی سوچوں میں ڈوبتے ابھرتے گھر میں ادھر سے ادھر پھر رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں سب گھر والے ڈرائنگ روم کے صوفوں پہ دور دور بیٹھے ہراساں چہروں سے خبریں سن رہے ہیں اور دبی دبی آوازوں میں تبصرے کر رہے ہیں۔

''نعیم میاں یہ ''کرونا'' کے بارے میں سنا؟ کہتے ہیں کہ

''ابا آپ اندر چلیں میں آپ سے بات کرتا ہوں اندر آ کے'' اس سے پہلے کہ شفیق صاحب بات مکمل کرتے نعیم نے اٹھ کے انہیں آگے بڑھنے سے روکا۔ وہ رک گئے بلکہ ٹھٹھک گئے۔

''ہاں میں نے سنا بچاس سے اوپر کے لوگوں کو زیادہ خطرہ ہے۔ مجھے فکر تھی سب کی...... میں تو دیکھنے آیا تھا کہ سب گھر ہی ہیں ناں؟''

''ہاں ابا جی گھر ہی ہیں سب۔ بلا کی طرح پھیلی ہوئی ہے یہ وبا تو۔ کئی دن سے سارا انتظام چوپٹ ہے۔ آپ کے کمرے کا ٹی وی خراب تھا اور آپ کو بخار بھی تھا۔ بچے تو ڈر رہے تھے کہ آپ کو بخار میں یہ وبا لگ ہی نہ گئی ہو...... کسی کو بھی لگ سکتی ہے...... ابا''

نعیم میاں ابا کو ان کے کمرے کے دروازے تک پہنچا کے رکے۔ ''آپ اندر جائیں۔ میں فرید کو بھیجتا ہوں آپ بتایئے گا کیا چاہیے؟''

''بس واپس آ جائیں کہ وبا لے کے ہی آئیں گے'' بہو بیگم کی آواز تھی۔ شفیق احمد مضمحل سے قدموں سے اندر آ گئے۔ یکدم صدیوں کی تھکن وجود میں اتر آئی۔

''آج ہی آپ کے کمرے کا ٹی وی ٹھیک کروایا ہے ابا۔ خبریں چلائیں دیکھیں اس جان لیوا وبا سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔''

''دیکھا ہے میں نے نعیم میاں دیکھا ہے احتیاط تو لازم ہے لیکن گریز یا نفرت نہیں۔ اب سمجھ آئی پچھلے کئی دن سے میرے کمرے میں صرف فرید ہی کیوں آ جا رہا تھا...... اچھا جاؤ۔۔ بیٹا'' شفیق احمد بستر پہ ٹکتے ہوئے بولے۔

''بچوں کا اور اپنا بہت خیال رکھنا۔''

نعیم جانے لگے تو شفیق احمد نے پھر پکارا۔

''میرا بھی پیار رکھنا۔ خیر خبر رکھنا... بیشک ملنے نہ آؤ.. پوچھتے رہنا فرید سے''

نعیم بھیگی آنکھیں صاف کرتے چلے گئے وہ کیا کر سکتے ہیں۔ ہر طرف توبہ استغفار ہو رہی ہے۔ گھروں کی چھتوں پر اذانیں دی جا رہی ہیں لیکن گھروں کے اندر...... رات رات بھر گانے

بجانے، فلمیں، دوستوں سے فون پہ لمبی لمبی باتیں اور دبا سے متعلق تبصرے چلتے ہیں۔ رویے نہیں بدلتے۔ بس توبہ استغفار کا شور ہو جاتا ہے۔

اگلے کچھ دن میں صورت حال بالکل ہی بدل کر رہ گئی۔ ہر طرف سناٹا نظر آتا۔ ''لاک ڈاؤن'' شہر شہر گاؤں گاؤں لگا دیا گیا۔ ہسپتالوں کا عملہ اور پولیس والے سر دھڑ کی بازی لگائے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ معاشی حالت تو قابل رحم ہو گئی۔ سوشل میڈیا اور ٹی وی چینلز چیخ چیخ کے خطرات کا ہراس پھیلا رہے تھے۔ یہ دبا امیر غریب کی تمیز نہیں کر رہی تھی بلکہ امیروں کو زیادہ لپیٹ میں لے رہی تھی۔ پہلے اور طرح کی دوڑ لگی ہوئی تھی اب اور طرح کی دوڑ لگ گئی۔ ذخیرہ اندوزی ہونے لگی، قحط نظر آنے لگا۔ لوگ رات کے اندھیرے میں اپنی سکوٹر اور گاڑی لے کے نکلتے اور جتنی ہمت اور جیب اجازت دیتی راشن بھر لاتے۔ کوئی کسی دوسرے کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔

شفیق احمد کی صحت بہتر ہونے لگی۔ خبروں میں دیکھ رہے تھے۔ دبا امیر غریب نہیں دیکھ رہی۔ ناتی بوڑھے اور جوان کی تمیز کر رہی ہے۔ روز دنیا بھر میں سینکڑوں لوگ اس موذی دبا میں مبتلا ہو رہے تھے اور سینکڑوں میں ہی مر بھی رہے تھے۔ آپا دھاپی عروج پر تھی لیکن گزرتے دنوں میں ایک چیز اچھی ہو گئی۔ لوگ اپنے گھروں میں راشن بھر بھر کے اور اپنے آپ کو بچا بچا کے تھک گئے تو دوسروں کا احساس کرنے لگے۔ جیسے اور جتنا ممکن ہو رہا تھا ملک ملکوں کی اور لوگ لوگوں کی مدد کرنے لگے۔ جوان افراد کی اموات کی خبروں نے بوڑھے والدین سے گریز کو کم کر دیا۔ سیاست دان تک محبت کی زبان بولنے لگے۔

شفیق احمد کے دوست کے جوان بیٹے کی اس دبا سے موت ہو گئی تو نعیم میاں کے اندر خوف کا بت ڈھے گیا اپنی اولاد کے لیے دعا کروانے اباجی کے پاس چلے آئے۔ بہت پریشان تھے۔ بڑے بیٹے علی میں مرض کی علامات تھیں اسے قرنطینہ میں چھوڑ کر آئے تھے۔ دل مٹھی میں قید تھا۔

باپ کے پاس آ بیٹھے۔ تو شفیق احمد بولے۔

''نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی نے ان سے پوچھا کہ میں اپنا اونٹ باندھے بغیر اللہ پہ توکل کر لوں کہ وہ حفاظت فرمائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ پہلے اونٹ کو باندھو پھر اللہ پہ توکل کر کے سکون سے سو جاؤ..... توکل اپنی جگہ نعیم میاں حفاظت ضروری ہے۔ احتیاط ضروری ہے۔ وہ جو تخلیق کرتا ہے میرا رب اپنی ہی تخلیق تباہ و برباد تھوڑی کرے گا۔ کرم فرمائے گا ان شاء اللہ۔ بس جھٹکا لگاتا ہے۔ جتنی بڑی غفلت اتنا بڑا جھٹکا۔ قانون کی پاسداری کرتے ہیں۔ آؤ مل جل کے دعا اور دوا کرتے ہیں۔ سننے میں آیا ہے اب تو اس دبا سے لوگ بچنے لگے ہیں اور دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اباجی سننے میں آ رہا ہے یہ بھی سائنس کی سازش ہے۔ آبادی کم کرنے کا طریقہ ہے۔ اس پہ برسوں سے کام ہو رہا تھا، جن لوگوں کی قوت مدافعت کم

سے وہ مر جائیں گے، مقابلہ نہیں کر پائیں گے"
"سننے میں تو بہت کچھ آرہا ہے ابھی بہت کچھ آئے گا لیکن میرا اللہ رسی دراز چھوڑتا ہے۔ پھر کھینچ لیتا ہے اور جو لوگ اس کی رسی مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں کسی بھی مشکل میں، آڑے وقت میں تفرقے میں نہیں پڑتے وہ گزر جاتے ہیں ان مشکلوں سے۔ دیکھو کیسے اس نے بھاگتے دوڑتے، شہرت اور دولت کے عروج کو چھیتے لوگوں کو پکڑ کر بٹھا دیا ہے۔ آرام سے گھروں میں بیٹھ گئے۔ وہ دکھا رہا ہے کہ نظامِ زندگی پھر بھی چلے گا۔ قوموں پر ایسے وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ ڈر کا یا وعظ و نصیحت کا وقت نہیں ہے۔ تحمل کا وقت ہے۔ حکمت عملی کا وقت ہیں۔" یہ دیکھو وزیراعظم کہہ رہا ہے ہم ہر گلی کوچہ بند کر دیتے لیکن میرا ملک غربت سے دوچار ہے۔ لوگ کچی آبادیوں کے چھوٹے چھوٹے گھروں میں سات آٹھ لوگ ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ ہم ہر گھر میں راشن نہیں پہنچا پا رہے۔ اس لئے جزوی لاک ڈاؤن ہے۔ وسائل سے یہ جنگ نہیں جیتی جائے گی۔ حکمت عملی سے جیتیں گے۔ نوجوانوں کی ٹائیگر فورس بنائی جا رہی ہے۔ یہ ان علاقوں میں کھانا پینا پہنچائیں گے۔ یہ لوگوں کو بتائیں گے کہ جو بیمار ہیں وہ اپنے آپ کو خود سنبھالیں، الگ کر لیں۔ جلد اس وبا سے نکل آئیں گے۔ بیمار کو مجرم نہ سمجھا جائے۔ یہ فورس لوگوں کے گھروں تک مدد پہنچائے گی۔ دوسری بات ہے ایمان کی قوت، صدقہ، خیرات اور سب سے بڑھ کے یہ کہ حقدار تک حق پہنچے۔ نظام شفاف طریقے سے چلے۔ حکومتیں ہمیشہ ریلیف فنڈ بناتی ہیں۔

مودی اپنی قوم سے معافی مانگ رہا ہے کیونکہ اس نے جلد بازی کی۔ حکمت عملی سے کام نہیں لیا۔

جو لوگ اپنے ورکرز کو نوکریوں سے نہیں نکالیں گے سٹیٹ بینک انہیں دوبارہ کھڑا ہونے کے لیے قرضے دے گا۔

ملک میں کوئی کمی نہیں ہے اناج کی۔ ذخیرہ اندوزی نہ کی جائے۔ دوسروں کی ضرورت اور بھوک اپنے گھر میں نہ سمیٹو۔

وبا کے خلاف جنگ جیتنی ہے تو ایک دوسرے کو دیکھو۔ مل کر کرونا وائرس کے خلاف لڑ سکتے ہیں۔ کہہ رہا ہے حکومت ایکشن لے گی"

"اللہ بہتر کرے گا۔ تم دیکھنا......وزیراعظم سے اختلاف بھی ہے تو یہ وقت اختلاف کا نہیں۔ ہاتھ نہ ملاؤ بیشک دل محبتوں سے معمور رکھو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ" شفیق احمد مسکرا کے بیٹے کو دیکھنے لگے۔ مسکراہٹ بھی تو ہمت ہے، دلاسہ ہے۔ محبت ہی زندگی کا احساس ہے۔

"اور میں بھی علی کو سینے سے لگا سکوں گا۔ دعا کریں ابا جی، میرا دل ٹھنڈا رہے دعا کریں۔ دعا تو رد بلا ہے۔" شفیق احمد کا وجود شکوے سے بھر گیا لیکن نظر نیچی کیے بیٹھے رہے۔

"کروں گا دعا بیشک دعا رد بلا ہے بیشک"

☆☆☆☆☆

# طلسم

یہ قصہ، کہانی، آپ بیتی یا متخیلہ، آپ اسے جو کچھ بھی سمجھیں، گزرے تقریباً تیس سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کل کی سی بات لگتی ہے بلکہ اس کے برعکس بہت سی باتیں ایسی ہیں جو لگتا ہے کہ کسی اور کے ساتھ بیتی ہوں گی۔ مجھے کچھ کچھ شائبہ سا ہوتا ہے کہ میں بھی وہاں موجود تھا۔ یادداشتوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یا منظر ہیں، جو آنکھوں کے سامنے آ کر گزر جاتے ہیں اور زیرلب مسکراہٹ، حیرت اور استعجاب چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ان باتوں کو یاد کرتا ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے یہ سب ابھی اس وقت بیت رہا ہے۔ اپنے آپ کو یہ باور کرانے میں کہ یہ ماضی تھا؛ مجھے مشکل ہوتی ہے۔ میں گڑبڑا جاتا ہوں، دوسرے الفاظ میں، میں خود پر بیتا ہوا وقت ایک دفعہ پھر گزار رہا ہوتا ہوں۔ اس لیے بیچ بیچ میں کہیں ماضی اور کہیں حال کا صیغہ استعمال ہو جائے تو مجھے معاف کیجئے گا۔

مجھے یہاں رہتے ہوئے تقریباً دس سال ہو گئے تھے۔ ہمارا تعلق تو ایک چھوٹے سے شہر سے تھا، وہاں میری ابتدائی تعلیم ہوئی۔ والد صاحب کی چھوٹی موٹی زمین داری کی برکت سے کراچی شہر میں بھی ایک گھر موجود تھا۔ جہاں میں بچپن سے آتا جاتا رہا ہوں۔ لیکن اعلیٰ تعلیم اور پھر ملازمت کی وجہ سے اب مستقل سکونت یہیں تھی۔ عید تہوار پر گھر والوں سے ملنے آبائی علاقے میں چلا جاتا تھا اور ہفتہ دس دن بعد پھر اکیلے گھر میں۔ یہ مکان دو منزلہ تعمیر کیا گیا تھا۔ پہلے میں نچلے حصے میں رہتا تھا اور اوپر بس خالی چھت تھی، لیکن پھر اوپر دو کمرے بنا کر باورچی خانہ، غسل خانہ اور ٹوائلٹ بنا دیئے گئے تھے، جہاں جانے کے لیے ایک راہداری سے گزرنا پڑتا تھا۔ کمروں کے سامنے والی جگہ یعنی لاؤنج میں کھانے کی میز پڑی تھی جو کم ہی استعمال ہوتی تھی۔ فریج اور فون بھی یہاں ہی رکھا تھا۔ باقی کافی بڑی چھت خالی تھی، جہاں ایک پلنگ اور کچھ کرسیاں ڈالی ہوئی تھیں اور ہاں چھت پر ایک طرف کو ایک سٹور سا بھی بنا تھا جو کاٹھ کباڑ سے بھرا تھا۔ ہم سادہ سے لوگ ہیں، چھت پر موجود پلنگ اور کرسیاں ہمارا مہمان خانہ بھی تھا اور ہر وقت بیٹھنے کی جگہ بھی۔ ہر مہمان یہاں کھلے آسمان تلے تازہ ہوا کا مزہ بھی لیتا تھا اور محلے میں ہونے والی ہر سرگرمی سے بھی مفت میں واقف ہو جاتا تھا اور حظ بھی اٹھاتا ہوگا۔ یہ الگ بات کہ محلے والے بھی ہماری ہر حرکت کا مشاہدہ کرنے میں آزاد تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ لاؤنج کے آگے دیوار نہ تھی بلکہ لوہے کی جالی لگا دی گئی تھی، یعنی دعوت نظارہ عام تھی۔ صرف کمرے میں دروازہ بند کر لینے کے بعد ہی کچھ خلوت میسر آتی تھی، تقریباً پورا گھر ہی اوپن ایئر تھیٹر کا منظر پیش کرتا تھا۔ حد تو یہ کہ باورچی خانے، غسل خانے اور ٹوائلٹ کی سامنے والی دیوار میں قدآدم کی اونچائی پر شاید ہوادار

ثانیہ انور

کے لیے بڑے بڑے روشن دانوں کی جگہ چھوڑ دی گئی تھی، جس میں کبھی چوکھٹ لگ کر روشن دان فٹ نہ ہو سکے۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ چوکھٹ پڑوسی اس وجہ سے ہمارے گھر کو مرغی خانے سے تشبیہ دیتے تھے۔ ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا کہ والد صاحب کی اس تعمیر کے بعد میں اوپر رہنے لگا اور نیچے کرائے دار آ گئے۔ جیسے کہ آپ نے اندازہ لگا ہی لیا ہوگا کہ اس وقت میں کوئی نوخیز لڑکا نہیں رہ گیا تھا۔ مجھے نوکری کرتے کرتے بھی آٹھ سال ہو گئے تھے۔ میری شادی کی عمر کب کی آ چکی تھی اور بہت تیزی سے گزر رہی تھی، مگر گھر والے اس وجہ سے اس طرف توجہ نہیں کرتے تھے کہ میری اکلوتی بہن ابھی کنواری بیٹھی تھی۔ ہم سب ہی گندمی رنگت والے قبول صورت اور اگر سچ کہوں تو واجبی سے ہیں، رہی سہی کسر کشادہ پیشانی اور گھنگریالے بالوں نے پوری کر دی ہے، اوپر سے ہمارا گھر ہمارے جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار تھا۔ چھوٹے شہر میں رہنے کی وجہ سے چھوٹا دماغ اور دیہاتی انداز و اطوار، ہم شہری آداب اور تکلفات سے نہ صرف عاری تھے بلکہ انہیں غیر ضروری خیال کرتے تھے۔

میں اس بات کو محسوس کر سکتا تھا کہ اب تک شادی نہ ہونے کی وجہ سے بہن کے مزاج میں بہت چڑچڑا پن آ گیا تھا۔ اور پھر پوری ذات برادری میں اس کی بدمزاجی کے چرچے الگ تھے۔ قصہ مختصر اگر کوئی روپے پیسے کے لالچ میں اس سے شادی کر لے تو کر لے، ورنہ کوئی دوسری وجہ مجھے تو نظر نہیں آتی تھی۔ روز و شب ایسے ہی پھیکے پن سے رینگ رہے تھے۔ اب تو رشتے داروں نے اماں کو یہ کہہ کر تنگ کرنا شروع کر دیا تھا کہ لڑکی کی نہیں ہوتی تو لڑکے کی عمر کیوں گزار رہی ہو جبکہ وہ شہر میں اکیلا رہتا ہے، کہیں بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔ وہ ذات برادری سے باہر کی کوئی خود ہی لا کر نہ بٹھا دے۔ یہ بات اماں کی سمجھ میں آ گئی اور انھوں نے مجھے لارے دینے شروع کر دیے کہ تیرے لیے لڑکی دیکھ رہے ہیں۔ اور پھر چن کر ایسی جگہ رشتہ دیکھتیں جہاں سے انکار ہونا لازمی ہوتا۔ جب چوتھی جگہ انکار ہوا تو میں ٹوٹ کر رہ گیا، اپنے اوپر سے اعتماد ہی ختم سا ہونے لگا حالانکہ میں سرکاری نوکری کر رہا تھا، تنخواہ اور زمینداری کی آمدنی ملا کر مناسب ہی حالات تھے۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میرے اور میرے خاندان کے طور طریقے شاید شہری اور اونچے گھرانوں کے لیے قابل قبول نہ تھے۔ ہر چند کہ ہم میں کوئی برائی نہ تھی، مگر مجھے لگتا کہ اماں کا انداز گفتگو، بہن کا مزاج اور میرا رہن سہن دیکھ کر سب ہی بدک جاتے تھے۔ اماں ایک سے ایک خوبصورت لڑکی پر انگلی رکھتیں، مگر مجھ گمنام پر نگاہ نہ ڈالتیں۔ مجھے یہ بدگمانی ہوتی کہ اماں کی نیت میں خلوص نہیں وہ صرف وقت گزار رہی ہیں۔ مجھے یہ مت دینے والے بھی قریبی رشتہ دار ہی تھے۔

ایک گرمیوں کی سہ پہر میں دفتر سے آنے کے بعد چھت پر شام کی چائے پی رہا تھا۔ غروب ہوتے سورج کی گرمی اور اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پانے کے لیے ادھر ادھر دماغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھ پر اچانک، واقعی اچانک انکشاف ہوا کہ ہمارے گھر کی دو قطاروں کے بعد والے گھر میں سے کوئی لڑکی مجھے دیکھ رہی ہے۔ دراصل اس کا گھر ہمارے گھر کی ترچھی قطار میں اس طرح بنا تھا کہ بیچ میں دو سڑکیں اور ایک گھر کی آڑ تھی۔ خوش قسمتی سے درمیان والے

گھر کی صرف نچلی منزل بنی تھا اور چھت خالی تھی۔ بعد میں غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ گھروں کی بناوٹ کچھ اس انداز کی تھی کہ اسے تو میرا گھر مرکزی دروازے سے لے کر چھت تک پورا نظر آتا تھا، لیکن میں اس کے گھر کا نصف ہی دیکھ پاتا تھا، البتہ سیڑھیاں چڑھنے اترنے والے صاف نظر آتے تھے۔ درحقیقت وہ لڑکی مجھے نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ ہمارے گھروں کے درمیان آئے گھر میں شادی چل رہی تھی اور اس وقت چھت پر رات کو ہونے والی مہندی کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہ ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ اتفاقاً ہم دونوں کی نظر ایک ساتھ ہی ایک دوسرے پر پڑی، تعجب ہے کہ میں نے آج تک اس گھر کو نوٹس ہی نہیں کیا تھا۔ یہی معاملہ دوسری طرف بھی تھا۔ یعنی ہم دونوں ہی برابری کی سطح کے شریف اور احمق تھے۔ وہ بھی اس بات پر ہکا بکا اور ہونق ہو گئی تھی کہ یہاں کوئی ذات شریف بھی رہتی ہے۔ اگرچہ گھروں کے درمیان فاصلہ اتنا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے خدوخال کو صحیح سے دیکھ نہ سکتے تھے، بس ایک اجمالی سا خاکہ ہی بن سکتا تھا۔ شاید اس کہانی کے لیے ہونے کی وجہ بھی یہی تھی۔ جیسے جھٹ پٹے میں ہر شخص کے خوبصورت نظر آنے کا چانس زیادہ ہوتا ہے، اسی طرح اتنی دور سے دیکھنے پر اپنے تخیل کو مہمیز کر کے اپنی پسند کے خدوخال تصور کر لیے تھے۔ اندازاً وہ کوئی سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ ہماری عمر میں اتنا فرق تھا کہ میں اس کی جانب متوجہ نہ ہوتا اگر وہ میری جانب اتنی توجہ نہ کرتی۔ یہ اس کا بچپنا ہی تھا کہ میں اس کی نگاہوں میں جچ گیا تھا۔ اب میں نے کنکھیوں سے بظاہر انجان بن کر اس کے گھر کی طرف دیکھنا یا جائزہ لینا شروع کیا اور وہ اتنی معصوم تھی کہ شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ میں واقعی لاتعلق ہوں، پھر میں نے دیکھا کہ وہ اپنے جیسی ہی دو اور لڑکیوں کو لے آئی اور مجھے لگا کہ وہ میرے گھر اور میرے متعلق ہی بات کر رہی ہیں۔ میری کہانی میں اتنی زیادہ دفعہ شاید کا لفظ اسی لیے آیا ہے کہ میں ان سب باتوں کا اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔ صحیح یا غلط بات تو اللہ ہی جانتا ہوگا، کیا پتہ وہ مہندی کے انتظامات پر تبصرے کر رہی ہوں اور میں یوں ہی خوش فہمی کا شکار ہو رہا تھا۔ مگر بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ میں اتنا غلط بھی نہ تھا۔ بعض اوقات ماحول اور حالات بھی ایسا اثر چھوڑتے ہیں کہ غیر محسوس طور پر ہم ان کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ شام کی ٹھنڈی ہوا اور مہندی والے گھر سے آنے والے رفیع کے رومانوی گانوں کی آواز نے سرمستی سی پیدا کر دی تھی۔ حالانکہ گانوں کا شور شرابا تو رات گئے تک جاری رہا لیکن اب یہ آوازیں اس بات کے باوجود کہ صبح اٹھ کر دفتر جانا ہے، گوارا ہو گئی تھی۔

اس کے بعد ڈیڑھ دو ہفتے تک خاموشی چھائی رہی۔ میں اس شام کی بات کو اپنی خوش گمانی سمجھ کر اور بھی جھلا گیا۔ اب یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ میرا دھیان جب میں گھر میں موجود ہوتا تو اس گھر کی طرف ہی لگا رہتا۔ کوفت میں قسم کھانے ہی لگا تھا کہ آئندہ کبھی ایسی بات پر توجہ نہ دوں گا کہ گھر کی گھنٹی بجی، جا کر جو دیکھا تو میری خالہ اپنے بچوں کے ساتھ موجود تھیں۔ بتایا کہ یہاں قریب میں شاپنگ کرنے آئے تھے تو سوچا پانچ منٹ کے راستے پر مجھ سے ملاقات کرتے جائیں۔ گرم گرم سموسے اور جلیبیاں پکڑے

میرے چھوٹے خالہ زاد بھائی نے کہا کہ بھائی جان جلدی سے چائے بنالیں۔ وہ لوگ فریش ہو کر ڈرائنگ روم یعنی چھت پر براجمان ہو گئے اور میں نے چائے کا پانی چڑھا کر کچن کی کھڑکی میں سے ان کو دیکھنے کے لیے جو جھانکا تو وہی منظر ایک دفعہ پھر آموجود تھا۔ یعنی وہ لڑکی پرشوق نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ خالہ لوگ تقریباً ایک گھنٹے موجود رہے اور وہ بھی۔ اب میرے گھبرانے کا وقت شروع ہو چکا تھا، اول تو یہ کہ وہ ہمیں دیکھ رہی تھی، دوم یہ کہ مہمانوں میں سے کوئی اسے نہ دیکھ لے۔ ہر چند کہ میں کوئی بانکا جوان نہ تھا مگر دل میں چور ہونے کی وجہ سے بوکھلا گیا تھا۔ کافی جتن کر کے بیٹھنے کی ترتیب اس طرح بنائی کہ زیادہ تر لوگوں کی پیٹھ اس کے گھر کی طرف ہو اور میرا منہ۔ ایک دفعہ سموسہ ہاتھ سے پھسلا تو ایک دفعہ جلیبی کا شیرہ قمیض پر ٹپکا۔ مجھے خود اپنے آپ پر حیرت تھی کہ میں کیوں بغیر کسی بات کے بدحواس ہوا جا رہا ہوں۔ دراصل آدھا دماغ اپنی چھت پر اور باقی کا دماغ اور پورا دل اس چھت پر تھا۔ یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ خالہ زاد بہن کو دیکھ کر وہ لڑکی پیچھے ہی نہ ہٹ جائے۔

اپنے حالات کی وجہ سے میں بہت بے تاب ہو چکا تھا۔ میرا خدا جانتا ہے کہ میرے دل میں کچھ غلط نہ تھا۔ ہمارا کوئی جوڑ بھی نہ تھا۔ شاید یہ میری تنہائی اور فراغت کی وجہ تھی کہ میں چاہتا تھا کہ کچھ ہو، کچھ بھی بے ضرر، معصوم سا۔ جب بعد میں اس ساری بات کا تجزیہ کیا تو یہ نتیجہ نکالا کہ انسان چاہتا ہے کہ اسے اہمیت دی جائے، بہت سارے نہیں تو کچھ لوگوں کے لیے تو وہ خاص ہو، کوئی اسے پسند کرے، کوئی اس سے محبت کرے اور اگر کوئی اس کے لیے پاگل ہو تو کیا کہنا جیسے زندگی کا مقصد پورا ہو گیا، دل مطمئن ہو گیا، خوشی، غرور اور سرمستی حاصل ہو گئی۔ حالانکہ اس وقت یہ ساری باتیں میرے پیش نظر نہیں تھیں، بس یہ خیال تھا کہ میں بھی کوئی چیز ہوں، کوئی مجھے بھی نظر بھر کر دیکھتا ہے۔ اس وقت اپنی خود اعتمادی کے لیے مجھے یہی چاہیے تھا۔ کیونکہ میں بہت حقیقت پسند واقع ہوا ہوں، اس لیے اس سے زیادہ کی مجھے توقع تھی نہ امید۔

اس کے بعد تو یہ معمول ہو گیا کہ شام کو مغرب سے پہلے وہاں چہل پہل نظر آتی، چار یا پانچ ایک جیسی عمروں، قد کاٹھ کی لڑکیاں سیڑھیاں چڑھتے اترتے نظر آتیں۔ اب میرے لیے تقریباً 30 میٹر کے فاصلے پر موجود لڑکیوں میں، چشمہ لگا ہونے کے باوجود فرق کرنا مشکل تھا۔ سب کی شکل وصورت اور جسامت ایک جیسی تھی۔ اس بات کا اندازہ اس نٹ کھٹ شرارتی لڑکی کو بھی تھا، تبھی تو وہ نڈر ہو کر سامنے آتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ کبھی مجھے لگتا کہ اس کھیل میں وہ اکیلی ہے، کبھی گمان گزرتا کہ ایک اور بھی اس کی راز دار ہے۔ بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ دو ہیں۔ ان لڑکیوں میں سے کوئی تو اجنبیت سے اس طرف دیکھے بغیر یا لاپروائی اور بے اعتنائی سے گزر جاتی تھیں، جیسے روئے زمین پر یہ گھر موجود ہی نہیں اور کوئی آدھا آدھا گھنٹہ مسلسل میرے گھر کی طرف دیکھتے پائی جاتی۔ میں کپڑوں کے رنگ سے شناخت کرنے کی کوشش کرتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

اس شیطان کی خالہ کی شرارت بڑھتی گئی اور ایسے لگا جیسا کہ میری نگرانی ہو رہی ہے۔ میں کب سو کر اٹھا، کب ٹوائلٹ گیا، کب ناشتہ کیا، نہانے میں کتنی دیر لگائی، دفتر جانے کے لیے کتنی دیر میں تیار ہو کر نکلا ایک ایک لمحہ مجھے دو آنکھیں دیکھ رہی ہوتی تھیں۔ کبھی چھپ کر اور کبھی سامنے آ کر۔ شروع شروع میں تو دیکھے جانے پر میں خوش ہوا پھر جز بز اور پھر پریشان اور بعد میں حیران کہ آخر کیوں؟، میرا مذاق اڑایا جا رہا ہے یا مجھے بے وقوف بنایا جا رہا ہے؟ یا کوئی مجھے پاگل کر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے رات کے کھانے کے بعد چھت پر چہل قدمی کی عادت تھی تو جناب سامنے بھی کتاب ہاتھ میں لیے دو لڑکیاں ٹہل ٹہل کر اپنے سبق یاد کرتی نظر آتیں، گویا دفتر جانے کے وقفے کے علاوہ میری پوری جاسوسی کا انتظام تھا۔ میں اس بات پر الجھن کا شکار کہ آخر ان چار پانچ میں سے کون اور کیوں۔ اسے میری سادگی کہیں یا بد ذوقی کہ مجھے اپنے کپڑوں کی زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی، دو شلوار قمیض تھے ایک سفید اور ایک ہلکا بادامی جو گھر میں پہنتا تھا باقی تین چار پتلون قمیض جو کہ دفتر جاتے ہوئے زیب تن کرتا، اب جو نوٹس کرتا ہوں تو سامنے چھت پر بھی بادامی رنگ کے کپڑے یا پھر جیسا میرے پاس گہرا نیلا چیک ہے، ویسا ہی ملبوس، اگر انصاف سے کام لیں تو یہ سب کسی کو بھی پاگل کرنے کے لیے کافی ہے، میری سوئی یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے پر اٹک جاتی۔ میں شریف خاندان کا چشم و چراغ تھا اور وہ بھی عزت دار خاندانی لوگ، ہر چند خوش قسمتی سے ہماری ذات برادری بھی ایک تھی لیکن کوئی تعلق داری نہیں تھی۔ میں نے اپنے تئیں محلے والوں سے غیر محسوس طریقے پر اس خاندان کی جو چھان بین کی تو سب طرف سے مثبت رائے ہی ملی۔ وہ خاندان محلے میں زیادہ ملتا جلتا نہیں تھا۔ بچیاں بھی صرف پڑھائی میں تھیں۔ کسی اور سرگرمی میں کسی نے ان کو نہ دیکھا تھا۔ اس بات کی گواہی تو میں بھی دوں گا کہ اس بات کے علاوہ کہ ان میں سے دو مجھے دیکھتی تھیں اور جیسے ہی میں ان کی طرف متوجہ ہوتا، وہ ادھر ادھر ہو جاتیں، میں نے کوئی قابل گرفت بات ان میں نہ دیکھی، میں نے ان کو کبھی ہنسی ٹھٹا کرتے، چلتے اٹھلاتے نہیں دیکھا۔ نو عمری کے باوجود ہمیشہ سادگی اور وقار کے ساتھ دیکھا، معلومات کرنے پر اتنا علم ہو سکا کہ وہ تین بہنیں ہیں اور ان کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ ایک اور لڑکی ان کی چچازاد ہے جو پڑھائی کی وجہ سے ان کے گھر مقیم ہے۔ بہر حال دن تیزی سے گزرتے گئے اور یہ دور دور سے لکا چھپی کا کھیل جاری رہا۔ میرا کوئی ایسا دوست نہ تھا جسے میں یہ ساری بات بتاتا، بتاتا بھی تو کیا، کچھ تھا ہی نہیں۔

آپ یقین کریں گے کہ ڈیڑھ دو سال کا وقت گزر گیا۔ ہماری سرراہ دو دفعہ مڈبھیڑ ہوئی، ایک دن میں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے دفتر سے جلدی گھر آ رہا تھا کہ دن کے دو بجے کے قریب چھ سات لڑکیوں کا جھنڈ کالج کے کپڑوں میں واپس اپنے گھروں کی طرف رواں دواں تھا، یہ

سب کی سب ہماری محلے دار تھیں اور ان میں وہ چار لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ میرا سر چکرا گیا کہ آخر ان میں سے ''وہ'' کون ہے۔ مگر وہ سب ایسی اجنبیت سے گزریں کہ جیسے میرا کوئی وجود ہی نہیں، طبیعت اور مضمحل ہوگئی، پھر میں نے خود کو تسلی دی کہ میں گاڑی میں تھا اور وہ پیدل، اب وہ ہر گاڑی میں جھانک جھانک کر تو نہیں دیکھتی ہوں گی۔ تقریباً ہفتے کے بعد میں اسی وقت پر راستے کی ایک دکان پر کھڑا ہو کر ان کو سامنے سے آتا دیکھ رہا تھا۔ اب کہ میں نے اپنی پوری ہمت جمع کر کے ان کے چہروں کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی، خوش قسمتی سے آج صرف وہ چاروں ہی دو دو کی ٹولی میں آگے پیچھے چلتی آرہی تھیں، اُف میرے خدا! ان کی شکلیں تو حد درجہ مماثل تھیں۔ عمروں میں بھی یقیناً ایک دو سال کا ہی فرق تھا۔ مجھے ایسے اتنا قریب دیکھ کر پیچھے چلنے والی دونوں لڑکیوں کے چہرے پر ایک رنگ آیا، دوسرا گیا، میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا چلو کوئی سرا ہاتھ لگنے کی تو امید ہوئی۔

اماں کا فون آیا کہ میں چھٹیاں لے کر کچھ دن کے لیے گھر آجاؤں کیونکہ بہن کے رشتے کے لیے جو بات چل رہی تھی، وہاں سے مثبت جواب آیا ہے۔ میں آکر لڑکے سے مل لوں اور پھر کوئی رسم کر کے شادی کی تاریخ دے دیں۔ بات ہی ایسی تھی کہ مجھے ضروری جانا پڑا۔ وہاں دو ہفتے لگ گئے مگر اطمینان اور خوشی کی بات یہ تھی کہ لڑکا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا تھا، شکل وصورت میں تو میری بہن سے بھی اچھا تھا، بس مالی طور پر ہم سے کمزور تھے۔ میری اماں نے پھر اس عزم کا اظہار کیا کہ بہن کی شادی ہونے کے فوراً بعد میری شادی کر دیں گی، میں نے جواب دیا ہے کہ ابھی صرف بہن کی شادی کا سوچیں مجھے رہنے دیں۔ میں تو یہ کہہ کر شہر واپس آگیا لیکن میری بات کا اماں پر اُلٹا اثر ہوا، اماں نے شہر میں رہنے والے ہمارے دور دراز کے رشتہ داروں کے گھر میرا رشتہ ڈال دیا۔ انہوں نے جواب دینے کے لیے وقت مانگا، ادھر بہن کی شادی بھی چھ مہینے بعد ہونا قرار پائی تھی تو اماں کو بھی جلدی نہ تھی، مجھ سے اس بات کا ذکر اس لیے نہ کیا کہ انکار کی صورت میں میرا دل خراب ہوگا۔ ادھر جب میں دو ہفتے بعد واپس آیا تو دوسری چھت پر جوش وخروش کچھ بڑھا ہوا محسوس ہوا۔ میں بھی رات کھانے کے بعد پندرہ منٹ ٹہلنے کے بجائے پون گھنٹہ چہل قدمی کرتا۔

پھر ایک عجیب سی بات ہوئی، میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ گرمیوں کے موسم میں مجھے اچانک سردی لگ کر تیز بخار ہوگیا۔ عجیب بے کلی سی طاری ہوئی، کچھ سمجھ نہ آتا تھا یا یوں کہوں کہ کسی طور قرار نہ آتا تھا۔ چھٹی کے وقت سے پہلے ہی دفتر سے نکل کر گھر کی راہ لی۔ اندازاً چار بجے کے قریب کا وقت ہوگا، جب میں گھر پہنچا، ابھی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا ہی تھا کہ سامنے وہ چھت سے اترتی ہوئی دکھائی دی، مجھے احساس ہوا کہ اس غیر متوقع وقت پر نظر آنے پر وہ ٹھٹکی ہے، لیکن میں بخار سے نڈھال بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ کسی کروٹ چین نہ آتا تھا، ایسا لگتا تھا کہ جیسے جسم میں تشنج کی کیفیت طاری ہے۔ اس بات پر رنجیدہ کہ اس حال میں کس کو

بتاؤں، کس کو بلاؤں، تنہائی کا شدید احساس مجھے مار گیا، غیر ارادی طور پر میں اٹھ کھڑا ہوا اور لاؤنج سے سامنے چھت پر نظر ڈالی تو وہ گرمی میں دروازے کی اوٹ لیے میرے گھر کی جانب ہی دیکھ رہی تھی، میں اپنے حواسوں میں نہ تھا، انتہائی سرعت سے دروازے سے باہر نکل آیا، اس نے مجھے نکلتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا، میں نے نیچے کھیلتے ہوئے بچوں سے سائیکل لی اور اس کے گھر کی جانب لمحوں میں پہنچ گیا، وہ سیڑھیوں سے اتر رہی تھی اور میں اس کے گھر کے سامنے والی سڑک پر اس کے روبرو تھا۔ یہ میری اس سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ بخار کی شدت سے میرا گندمی رنگ لال ہو رہا تھا، روکھے، کالے سفید کھچڑی بال اڑ کر پیشانی کو اور وسیع کر رہے تھے، جانے چہرے سے کیا جنون ظاہر ہو رہا تھا، ابھی تک ہمارے درمیان دو تین گھروں کا فاصلہ تھا غیر متوقع طور پر مجھے اتنا قریب دیکھ کر وہ ڈر گئی، شاید اسے احساس ہوا کہ وہ پکڑی گئی ہے، گھبراہٹ کے عالم میں وہ کچھ لمحے ہراساں سا چہرہ لیے مجھے دیکھتی رہی اور پھر غائب ہو گئی۔ طلسم ہوش ربا جس نے واقعی میرے ہوش اڑا رکھے تھے، ٹوٹ گیا، انوکھی بات یہ تھی کہ حصار سے باہر جاؤ تو طلسم ٹوٹ جاتا ہے، یہاں حصار کے اندر آنے پر یہ ہوئی ہوئی۔ جیسے کالی اندھی چلے اور سب اڑ جائے۔ اس لمحے کی کشش، طاقت اور جذب ناقابل بیان اور ناقابل فراموش ہے، جس سے صرف وہ ہی نہیں میں بھی ڈر گیا تھا۔ میں پسینے سے شرابور واپس گھر آ کر بستر پر پڑ رہا۔ اس کو دیکھ کر اس تو عمر بندی کا خیال آیا جو ابھی پہاڑ جیسی ہیبت ناک چیز کا سینہ چاک کر کے باہر آئی ہے اور اسے خود بھی اپنی تندی اور قوت کا اندازہ نہیں۔ جو دور سے تو مدھم، سریلی سنائی دیتی ہے لیکن قریب آنے والے کو بہا لے جاتی ہے، نابود کر دیتی ہے۔ خدا جانے کتنی دیر بے ہوش پڑا رہا، رات کو کسی پہر آنکھ کھلی تو ہر سمت گھپ اندھیرا تھا۔ اپنی چھت والی لائٹ جو میں مغرب کے وقت جلاتا تھا، بند پڑی تھی۔ سامنے والی چھت پر بھی سکوت طاری تھا اور پھر یہ سکوت پھیلتا چلا گیا ہر سمت ہر زمان اور ہر مکان میں۔ شورش کا وہ لمحہ گزر چکا تھا۔ میں ایسا نڈھال ہوا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ مجھے کب کرایہ داروں نے ہسپتال میں داخل کروا دیا اور میرے گھر والوں کو خبر کر دی۔

میرے گھر میں تو گہما گہمی ہو گئی، عیادت کے لیے آنے جانے والوں کا تانتا بن گیا۔ جن میں میرے ہونے والی سسرالی بھی شامل تھے۔ لیکن جس کے متعلق جاننے کی خواہش تھی وہاں کی کوئی خبر نہ تھی، ہوتی بھی تو کیسے کوئی رابطہ ہی نہ تھا۔ میں تو صرف اپنے اوپر گزرنے والے حادثے کو جانتا تھا، دوسری طرف تو خاموشی تھی گہری خاموشی، جس میں غوطہ زن ہونے کے بعد بھی میں صرف ٹامک ٹوئیاں ہی مار سکتا تھا اور آج تک جب زندگی اتنا آگے بڑھ گئی ہے، میں یہ سمجھنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں کہ وہ سب کیا تھا، کیوں تھا، کچھ تھا بھی یا نہیں۔

☆☆☆☆☆

# لو میرج Love Marriage

''تم نے تو میری زندگی جہنم سے بھی بدتر بنا دی ہے، اس سے اچھا تھا کہ میں کنوارا ہی مر جاتا۔ یا اللہ آجکل کی تو عورتوں کے نخرے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کھانے کو کچھ ملے گا یا نہیں۔''

وقار جو ابھی ابھی آفس سے واپس آیا تھا، زیبا آگے سے منہ بنائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے ان سب باتوں پر کان نہ دھرے نہ جواب دیا۔ زیبا اور وقار پہلے یونیورسٹی کلاس فیلوز تھے۔ دونوں آفس میں بھی اکٹھے کام کرتے تھے، ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ گزشتہ سال دونوں کی لو میرج ہوئی تھی۔ وقار نے زیبا کی آفس سے چھٹی کروادی کیونکہ وہ اب وقار کی عزت بن چکی تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ غیر مردوں میں کام کرے۔

وہ جو کب سے بول رہا تھا ایک بار پھر سے اس کی خاموشی پر چڑ کر کہنے لگا ''اب کچھ کھانے کو بھی ملے گا یا پیٹ پہ پتھر باندھ لوں۔''

پھر سے وقار نے بآواز بلند غصے سے کہا تو زیبا بھی چپ نہ رہی کہنے لگی

''اب مجھ سے تمہارے نخرے یہ چالاکیاں ایک منٹ بھی برداشت نہیں ہوتیں، نوکرانی سمجھ رکھا ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے کسی پل سکون کا سانس بھی لینے دیا ہے۔''

اتنے میں ہمسائے کی عورت کا سر گھر کی چھت سے نظر آیا تو شرم کے مارے زیبا چپ ہوگئی، اس کے لبوں سے ابھی بھی الفاظ نکل رہے تھے شاید وہ مزید کچھ اور داستان سنانا چاہتی تھی۔

ہنستے بستے گھر میں روز چپقلش رہنے لگی تھیں۔ پہل پہلے تو دونوں ایک دوسرے کے بنا رہ نہیں سکتے تھے مگر بعد میں تو جیسے جیسے دن گزرتے گئے نجانے محبت تو کہیں دفن ہوتی چلی گئی۔

شام کے چار بج چکے تھے۔ سردی سے کپکپاتے ہوئے زیبا تمام الماریوں سے اپنے کپڑے نکال کر بیڈ پہ پھینکنے لگی یہاں تک کہ گھر میں ہر وہ چیز جو اس کے زیر استعمال تھی سب صندوق میں بند کیں اور باہر آ گئی اور برآمدے میں کھڑے ہو کر میکے کال کرنے لگی۔ زیبا کی کوئی کال نہیں اٹھا رہا تھا۔

نعمان حیدر حامی

"زیبا جلدی سے کپڑے استری کر دو، آج باہر چلتے ہیں۔ تمہارا موڈ بھی اچھا ہو جائے گا۔"

وقار فریش ہو کر گھر میں زیبا کو ڈھونڈ رہا تھا۔ سچ کہتے ہیں مرد کی ساری انائیں عورت کی محبت کے آگے بے بس ہو جاتی ہیں۔ مرد پسندیدہ عورت کے لیے بادشاہت اور سلطنت تک کے سودے کر سکتا ہے مگر اپنی پسند کو کسی اور کے حوالے نہیں کر سکتا۔ عورت کی محبت جس قدر لازوال ہے وہی پر اس میں ذرا سی بھی خلش سب کچھ تباہ کر دیتی ہے۔ وقار سب کچھ بھول چکا تھا۔ وہ دراصل زیبا کو بھی یہ سب غصہ بھلانا چاہتا تھا مگر زیبا اپنا فیصلہ کر چکی تھی۔

اس کا موڈ کیسے اچھا کرنا اور کہاں جانا یہ سوچتے سوچتے اس کو تلاش کرتا وہ عین وقت برآمدے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس کے کانوں میں زیبا کی آواز پڑی جب وہ بھائی کو کال کر رہی تھی۔

"السلام علیکم! بھائی جلدی آئیں ----- مجھے بہت مارا ہے ----- وقار مجھے مار ڈالیں گے۔"

زیبا نے بہانا بنا کر روتے ہوئے بھائی کو کال کرتے ہوئے کہا۔

وقار برآمدے میں صندوق کے ہمراہ زیبا کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کیونکہ اس سے پہلے بھی جھگڑے تو ہوتے تھے ہر رشتے میں نوک جھوک تو ہوتی ہے وہ جو تھکا ہارا لوٹا تھا اور آگے سے اس کی ناراضگی اور خاموشی پر مزید جھنجھلا گیا تھا اور بول گیا۔ اس کو اپنے الفاظ کا احساس تھا مگر آج یہ سب کچھ نیا تھا وہ حیرانی سے اس کو کبھی اس کے پاس رکھے صندوق کو دیکھ رہا تھا جو نا جانے اور کیا کیا بول رہی تھی۔

چند لمحوں کی فرصت تھی کہ گھر کی بیل بجی وقار دروازے پر زیبا کے بڑے بھائی جمال کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ جمال، وقار سے دست و گریباں ہو گیا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بہن کو مارنے کی۔ میں تمہیں دیکھ لوں گا۔ اور تم آؤ زیبا سامان رکھو رکشے میں، اس سے تو ہم بعد میں نمٹ لیں گے۔"

جمال آگ بگولا ہو کر چل دیا۔

حیا پردے میں نہیں آنکھوں اور دل میں ہوتی ہے ورنہ کئی مشہور طوائفوں کو بھی میں نے بھرے بازاروں میں باپردہ دیکھا ہے۔ زیبا ایسے تبدیل ہوئی جیسے وقار سے محبت نہیں طوائفوں کی طرح وقت گزار رہی تھی۔ رشتوں میں خوشیوں کی روح کا وجود اس دن ختم ہوتا ہے جب محبت کے ترازو کا پلڑا ایک طرف سے بھاری ہو کر زمین پہ دھڑم ہوتا ہے۔ آج اس کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔

زیبا کے شادی سے پہلے جبران سے بھی یونیورسٹی میں تعلقات تھے۔ وہ وقار سے زیادہ جبران کو پسند کرتی تھی مگر سٹیٹس کے فرق کی وجہ سے پھر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ جبران بزنس کے سلسلے میں یونیورسٹی کی ادھوری ڈگری چھوڑ کر لندن چلا گیا تھا۔ جس دن زیبا اور وقار کا جھگڑا ہوا تھا اس کے ٹھیک تین دن بعد جبران اور زیبا کی ملاقات

ہوئی۔ جبران نے زیبا سے شادی کے متعلق پوچھا تو زیبا نے اشکوں کے ساتھ ساتھ وقار سے طلاق لینے کے سبھی تانے بانے سنا دیئے۔ جبران نے موقع پرستی دکھاتے ہوئے اس بات کا فائدہ اٹھانا چاہا اور زیبا کو بتایا کہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی حالانکہ جبران کی شادی اس کی کزن فرح خان سے لندن میں ہو چکی تھی اور اس کے دو بچے شاہزے اور حمزہ تھے۔ مجھے آپ جیسی ہم سفر کی تلاش ہے پھر ہم تو جانتے ہیں ایک دوسرے کو اس سے بہتر کیا جبران نے بھی اس میں اپنی دلچسپی ظاہر کر دی۔

زیبا نے اس کو بتایا

"مگر جبران میرے ہاں پہلی اولاد ہونے والی ہے۔ میں ایک بیٹی کی ماں بننے والی ہوں اس کو بھی مجھے ہی سنبھالنا پڑے گا۔"

جبران نے اس کی بات سنی تو بولا اس کا بھی حل ہے۔

"کوئی بات نہیں ----- وقار ضرور کورٹ میں بیٹی کی کسٹڈی کا دعویٰ کرے گا ----- بیٹی اس کے حوالے کر دینا کیونکہ ویسے بھی اب جب وہ تمھارا نہیں رہا تو آپ کو بھی اس کی بیٹی سے کیا غرض۔"

"ہاں یہ اچھا آئیڈیا ہے۔"

زیبا نے خوشی کا اظہار کیا۔

گردشِ روزگار نے کروٹ لی اور میکے میں ہی زیبا کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام رخسانہ زیب رکھا گیا۔ بیٹی کی پیدائش سے وقار بالکل بے خبر تھا۔ وہ زیبا جو شادی سے پہلے وقار کے ایک گڈ مارننگ کے میسج کا شدت سے انتظار کرتی آج وہ اس کے نام سے بھی نفرت کرتی تھی۔ نمبر بھی بلاک لسٹ کی نذر کر دیا گیا تھا۔ وقت کا تھا گزرنا سو وہ گزر رہا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد وقار زیبا کو منانے گیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ ایک بیٹی کا باپ بن چکا ہے۔

"السلام علیکم انکل! میں شرمندہ ہوں۔ میں نے غصے میں اس دن نجانے کیا کیا کہہ گیا یہ سارا وقت بہت مشکل رہا میں معذرت کرنے آیا ہوں۔ زیبا کہاں ہے؟"

بیٹا ماں، باپ ہمیشہ بیٹیوں کے گھر بستے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے معاشرے میں ایسے گھر بھی دیکھے ہیں ماں باپ گھر سے اخراجات دے کر بیٹیوں کے گھر بساتے ہیں۔ زیبا کے والد ایک شفیق اور معزز شخص تھے۔ انھوں نے وقار کو گلے لگاتے ہوئے کہا

"آئیے آئیے بیٹے اب اندر آؤ شرمندہ تو میں بھی ہوں اس دن جمال بیٹے نے بھی آپ کے ساتھ اچھا رویہ اختیار نہیں کیا، بجائے آپ دونوں کو سمجھانے کے بہن کو گھر لے آیا، آؤ بیٹا بیٹھو۔"

زیبا سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر خاموشی سے اپنے بابا اور وقار کی باتیں سن رہی تھی۔

وہ سیڑھیوں سے اترتی اندر داخل ہوتے وقار سے مخاطب ہوئی۔

"کیوں آئے ہو اب آپ یہاں میں اپنی قسمت کا فیصلہ کر چکی ہوں بہتر یہی ہوگا آپ ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جائیں۔ بابا! عزت تو ان کو دی جاتی ہے جو عزت کے لائق ہوتے ہیں۔ اس شخص نے مجھے دکھوں کی دنیا اور اذیت

کے سوا دیا ہی کیا ہے۔ میں اس منحوس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ اس گھر کے دروازے میرے والدین نہیں میں آپ کے لیے بند کر چکی ہوں میں نہیں رہنا چاہتی آپ کے ساتھ اب، بیٹی سے ملنا ہے تو آدھا گھنٹہ ہے مل لیں اور پھر چلتے بنیں۔'' زیبا کے والد تو خاموشی اور شرمندگی سے اپنی بیٹی کا ایسا رویہ دیکھ رہے تھے۔

وقار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ زیبا اب واپس نہیں آنا چاہتی مزید شرمندگی سے بچنے کے لیے اس نے بیٹی سے ملنے اور اسے دیکھنے کی ارداس کر دی۔

ثمرہ نوکرانی نے بچی لا کر وقار کی گود میں رکھ کر چلی گئی۔ وقار اسے دیکھتے دیکھتے اس کے ننھے ہاتھوں کو چومتا اپنی نم آنکھوں سے لگاتے الوداع کرتے ہوئے چپ چاپ چلا گیا۔ اس کی رات ساری سوچوں میں گزر گئی۔

وقار اپنے غصے پہ نادم تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا گھر اس کی محبت نیلام ہو جائے۔ اس کی بیٹی کو زمانے کی تلخیوں کو سہنا پڑے۔ وہ برآمدے کا ستون پکڑے نجانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ سوال تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اس ننھے سے وجود کو اپنی بانہوں میں اس لمس کو محسوس کر رہا تھا۔ ساری رات سوچتے سوچتے گزر گئی۔ صبح سویرے وقار کچن میں ناشتہ بناتے ہوئے زیبا کو یاد کر رہا تھا۔ وہ زیبا کے ہاتھ کے ناشتے کو بھی مس کر رہا تھا۔

''ہائے میرے خدایا! جل گیا۔۔۔ او ہو'' چائے وقار کے ہاتھ پر گری تو وہ کراہتے ہوئے پانی کی طرف بھاگا۔

دکھ درد، غم کے لمحات میں سگے رشتے بھی مرہم کا کام کرتے ہیں بشرطیکہ ان میں محبت اور احساس کا کنکھرا رنگ باقی ہو یہی تو رشتوں کی بنیاد ہوتی ہے۔ کیا اس کو مجھ سے محبت نہیں کیا اس کو ہماری بیٹی کا احساس نہیں ہاتھ پر بہتے پانی کو دیکھتے وہ پھر سے خود سے سراپا سوال تھا۔

بجتی ہوئی بیل نے اس کو ہوش کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا تو وہاں ایک پینٹ شرٹ اور کالا کوٹ پہنے ٹائی لگائے نوجوان داخل ہوا۔ وہ سلیم تھا جو وقار کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ انہیں وقار کے پڑوس میں گھر لیے چار برس بیت چکے تھے۔ وہ آ کر لان میں بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سے پہلے تو میاں بیوی کی آواز سنائی دیتی تھی مگر آج گھر میں یوں سناٹا کیوں۔۔۔؟

سلیم انہی سوچوں میں گم سم تھا کہ وقار دوسرے ہاتھ میں جلا ہاتھ پکڑے نمودار ہوا۔ وقار نے تعجب بھری نظروں سے وقار کو ایسی حالت میں دیکھ کر کہا

''اوئے وکی تمہیں کیا ہوا ہے؟..... بھابی کہاں ہیں؟..... خیر تو ہے نا''

وہ ابھی بھی درد اور جلن کے احساس میں مبتلا تھا۔ دھیمے لہجے میں کہنے لگا

''بس یار ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں؟''

''ارے مجھے کیا ہونا میں ٹھیک ہوں۔'' بھابی کہاں ہیں؟'' اس نے ایک بار پھر سے سوال دوہراتے

وقار کو کندھے سے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا جو کسی خیال میں گم ہو گیا تھا۔

وقار کے الفاظ تو جیسے جواب ہی دے گئے۔ وہ سن جسم لئے بے حس و حرکت بینچ کے سہارے بیٹھ گیا۔

"دیکھو یار محبت بھی عجیب ہوتی ہے، دکھ درد دے کر بھی طلب ختم نہیں ہونے دیتی، چاہ ہے کے کم ہوتی نہیں، ہر وقت یادوں کے سہارے جینا پڑتا ہے۔"

سلیم، وقار کی فلسفیانہ باتیں سن کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا ابھی بھی حقیقت سے نا آشنا تھا۔ اسے یہ سب مذاق لگ رہا تھا اس لیے وہ کہنے لگا

"اب سیدھی طرح بتاؤ گے یا میں بھابی کو بلاؤں وہ تمہیں ایک منٹ میں ٹھیک کر دیں گی۔"

"یہ سب تمہاری لاڈلی بھابی ہی کا کارنامہ ہے۔ گھر چھوڑ کر وہ جا چکی ہے کچھ عرصے سے۔ آفس سے تھکا ہارا آیا تو منہ بنائے بیٹھی تھی۔ ذرا سا غصہ ہو گیا، وہ تو پوری بستر باندھ کر بیٹھ گئی۔ بھائی کو بلوایا اور اس کے ساتھ چلی گئی۔"

سلیم زیبا کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ زیبا سلیم اور وقار ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔

"کہتا تھا نہ یہ لو میرج کچھ نہیں ہوتا سوائے ---- شادی اور بربادی کے ---- منع کیا تھا نہ کر زیبا سے شادی بھلا میری کون مانتا ہے؟ ---- سچ بتاؤ، وکی دوستی اور بھائیوں والا رشتہ اپنی جگہ زیبا کی نیچر ہی ایسی تھی ہر مرد میں دلچسپی لیتی تھی ---- کبھی کس کے ساتھ اور کبھی ---- اور تو اور وہ جبران بزنس مین کی تو وہ بہت بڑی فین تھی؟؟"

"سلیم بس میں مزید زیبا کے بارے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ وہ میری محبت ہے، میری بیوی ہے۔" وقار نے غصے سے سلیم کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

"وقت بتائے گا میرے دوست ہنڈیا چولہے پر نہیں چڑھائی جاتی، وقت ثابت کرے گا کہ مخلص اور منافق کون تھا؟"

سلیم تھوڑا سا غصے بولا مگر حقیقت پسندی کے آخری یہی الفاظ کہنے کے بعد چل دیا۔

اس کو وہاں سے آئے ہفتہ بیت گیا اس دوران وقار کے ہزار ہا رابطے کے باوجود زیبا کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ صبح کا وقت تھا۔ حسب معمول زیبا کے جانے کے بعد وقار آفس ہی کی تیاری میں مگن تھا کہ پوسٹ مین بے چارہ کافی دیر تک بیل بجاتا رہا، جب کوئی دروازے پہ نہ آیا تو اس نے ایک بند لفافہ دروازے کے نیچے سے نیوز پیپر کی طرح پھینک کر چلا گیا۔ آفس کے لیے وقار نکلنے لگا تو اسے وہی بند لفافہ نظر آیا، جھپٹ کر اٹھایا تو اسے ایک دم جھٹکا سا لگا، اس کی سانس گھٹن کا شکار ہو گئیں۔ دل دھک کر رہا گیا کیونکہ وہ عدالت کی طرف سے خلع کا نوٹس تھا۔

وقار کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے مگر وہ حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آفس کے لیے نکل پڑا۔ آفس پہنچ کر بھی اسکی سوچیں بھٹکی بھٹکی سی تھیں بار بار خیال زیبا اور بیٹی کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی تو بہت بار نوک جھوک ہوئی اس بار ایسا کیا کہ وہ معاف ہی نہیں کر رہی اور یہ اتنا بڑا قدم۔ وہ صحیح طرح سے کام بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ آفس کے دوستوں نے بھی موڈ آف دیکھ کر وقار سے پوچھ گچھ کی مگر وہ اس مسئلے کو ہر کسی سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آج آفس میں ان کے باس کی سالگرہ بھی تھی اسی سلسلے میں اس نے القائم ریسٹورنٹ میں بڑی تقریب رکھی ہوئی تھی۔ وقار کو بھی دعوت میں مدعو کیا گیا تھا۔ آفس میں کام کے بعد چھٹی ہوئی تو سبھی تقریب کے لیے روانہ ہو گئے۔ وقار بھی پریشانیوں میں گھری زندگی روانہ ہو گیا مگر القائم ریسٹورنٹ کا راستہ بھول گیا۔

ایک ریڑھی بان کے پاس رک کر پوچھنے لگا

''ارے چاچا جی القائم ریسٹورنٹ کہاں ہے؟''

وہ بزرگ سمجھدار تھا۔ وقار کے حلیے، آفس بیگ دیکھ کر کہنے لگا

''بیٹے لگتے تو آفیسر ہو، سامنے دیکھو اتنا بڑا سا نام تو لکھا ہوا ہے القائم ریسٹورنٹ..... لگتا ہے چار جماعتیں پڑھ کر بھی بھول چکے ہو۔''

بزرگ وقار کے اندرونی معاملات سے تو بالکل ناآشنا تھا مگر وقار کو اس کی بات ناگوار گزری مگر کیا کر سکتا تھا۔ ادھر سے تقریب سے بھی تھوڑا سا لیٹ ہو چکا تھا۔

وہ جیسے ہی ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تو اس کی نظر سامنے کھڑی زیبا پر پڑی جو عین اس وقت جبران کے ساتھ گپیں ہانک رہی تھی۔

''جبران تم اور تم میری بیوی کے ساتھ کیوں بیٹھے ہو؟ زیبا تم یہاں کیا کر رہی ہو۔''

وقار نے زیبا کے ساتھ بیٹھے جبران پر حملہ آور ہوتے ہوئے اس کے گریبان سے پکڑتے ہوئے کہا۔

زیبا جبران کے دفاع کے لیے بیچ میں آکر کہنے لگی۔

''مجھے لگتا ہے تمہیں وہ نوٹس نہیں ملا۔ ہم دونوں کا رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ میں نے آگے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر آئندہ اس کے گریبان پہ ہاتھ رکھا تو اس سے پہلے ہزار بار سوچنا...... سمجھے''۔ وقار کے ہاتھ گریبان سے چھوڑا کر کہاں۔

زیبا کا لہجہ بالکل احمقوں جیسا تھا جیسے اسے گھر اجاڑنے پہ ذرا برابر بھی دکھ نہیں پہنچا ہو۔

وقار چپ چاپ شرمندہ ہو کر بنا تقریب اٹینڈ کیے گھر واپس آ گیا۔ جب عورت مرد کی وفاؤں کو پاؤں تلے روند ڈالے اور مرد سے جی پھر لے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں کر سکتی۔

اگلے ہفتے عدالت میں وقار بذات خود پیش ہوا اس کی ہزار صفائیوں کے باوجود زیبا نے بیان دیا وہ وقار کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ عدالت کے روبرو پیش ہو کر وقار کی آواز گونجی۔

''طلاق ---- طلاق ---- طلاق''

عرشِ الٰہی تو کانپ ہی اٹھا مگر وقت نے سب کے حقیقی چہرے عیاں کر دیے۔ وہ وقار جو سلیم کی حقیقت پر اسے برا سمجھ کر مخلص دوست سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اسے آج معلوم ہوا کہ ہر شخص آپ کی زندگی میں آپ کا برا نہیں چاہتا۔ وقار اپنی بیٹی کی کسٹڈی چاہتا تھا جبکہ زیبا تو خود ہی کرنے والی تھی، زیبا نے بیٹی وقار کی کسٹڈی میں دے دی کیونکہ وہ اپنی نئی زندگی کی ابتدا ایک بیٹی کے بوجھ کے ساتھ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ رحمت خدا جو اس کو کسی زحمت سے محسوس ہو رہی تھی۔

زیبا اب وقار کے بوجھ اترنے کے بعد خود کو

ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ قدرت کا ایک قانون ہے کہ جب بندہ اللہ پاک کی عطا پہ ناشکری کرتا ہے تو اسے اس کی سزا دنیا میں ہی دے دی جاتی ہے تاکہ مزید خلق خدا بھٹکنے سے بعض آ جائے۔ وہ جو آنے والے وقت سے بے خبر نئی دنیا نئے خواب سجا رہی تھی۔

پانچ ماہ کے بعد جبران رشتہ لے کر آیا اور پاکستان میں موجود چند رشتے داروں کو ملوا کر رشتہ طے ہوا اور زیبا سے شادی ہو گئی۔ زیبا جبران کو پا کر جتنی خوش اس سے کہیں بڑھ کر جبران ناخوش تھا۔ وہ اندرونی معاملات اور بھیدوں بھری کتاب سے ناآشنا تھی۔ ایک ماہ شادی کو ہو چکا تھا۔ جبران کو بزنس اور پہلی فیملی بچوں کے پاس بھی جانا تھا وہ زیبا کو اپنے رشتے داروں کے گھر چھوڑ کر لندن روانہ ہو گیا۔ رشتے داروں میں سے بھی کسی نے زیبا کے سامنے جبران کی اصلیت سے متعلق زبان نہ کھولی۔

وہ لندن پہنچا تو فرح خان اپنے دونوں بچوں شانزے اور حمزہ کے ساتھ جبران کا ایئرپورٹ پہ استقبال کیا۔ گھر پہنچ کر جبران تھکا ہوا سو گیا۔ موبائل سائلنٹ پر تھا اور زیبا کی کالیں آ رہی تھیں۔ شانزے نے کال اٹھاتے ہوئے بولی

”ہیلو...... ابو سوئے ہوئے ہیں...... آپ کون؟ نام بتا دیں میں ابو کو بتا دوں گی؟“

لفظ ”ابو“ سن کر زیبا کو اچانک دھچکا لگا مگر اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگی

”میں زیبا جبران...... جبران کی وائف...... آپ کون؟“

”میں بیٹی ہوں...... جبران میرے بابا ہیں مگر میری ماما تو فرح خان ہیں...... سوری رونگ نمبر ہے۔“

شانزے نے کال کٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

زیبا موبائل پھینکا اس کی دنیا خواب سب اجڑ گیا تھا وہ چلا رہی تھی۔

”میں برباد ہو گئی...... جبران وہ دھوکے باز نکلا...... میرے ساتھ دھوکا کر گیا۔“

خاندان سمیت محلے میں بھی داستان زبان عام ہو چکی تھی۔ زیبا کے خواب چکنا چور ہو گئے تھے مگر اسے زندگی میں اپنے فیصلے غلط کرنے کا پچھتاوا تھا اندر ہی اندر ختم کر رہا تھا تنہائی جو اس کا مقدر ٹھہری کسی کی ذات کو توڑ کر محبتوں کی تذلیل کر کے اس پر خوشیوں کے محل کھڑے نہیں ہوتے وہ جان گئی تھی مگر وقت اب اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا وہ اپنوں اور وقار کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی مجرم اپنی بیٹی کی تھی وہ اچھی ماں نہ بن سکی آج وقت کے دی چوٹ پر وہ ماضی میں جھانکتی ہوش کی دنیا سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ یہ اذیت ہارٹ اٹیک کی صورت میں اس کی موت کا سبب بن گئی۔ آج وہ خالی ہاتھ اس دنیا سے منہ موڑ گئی۔

محبتیں عطا ہوتی ہیں اور عطائیں انعام میں ملا کرتی ہیں مگر جو قدر کریں۔ اس کی محبت کی کہانی میں--- لومیرج میں غلط فیصلوں پر سب کے حصے میں فقط خسارے آئے۔

☆☆☆☆☆

# تسنیم کوثر کی تخلیقی شخصیت

معاصر عہد کی وہ تاریخ جس نے کم وبیش گزشتہ تین عشروں سے اپنی تخلیقی فعالیت کو امتیاز بخشا ہے اس کی جھلک جن قابلِ ذکر تخلیق کاروں کے آئینۂ فن میں الگ سے جھلملاتی دکھائی دیتی ہے ان میں ایک نمایاں نام محترمہ تسنیم کوثر کا بھی ہے۔ آپ شاعرہ، افسانہ نگار اور سفرنامہ نگار، ہر تین حیثیت سے معروف ہیں۔ شاعری کے لمحوں میں کہانی کا احساس بھی جواں رکھتی ہیں اور کہانی لکھتے ہوئے فکری سفر کے سارے مناظر بھی ان کی تخلیقی پرواز کے ہمرکاب رہتے ہیں۔ شاعری، افسانوں اور سفرناموں پر مبنی ان کی متعدد کتب منظرِ عام پر آچکی ہیں:

رنگ ہونا کہیں خاکوں میں کہانی لکھنا
داستان غم کی، کوئی یاد پرانی لکھنا

دیکھنا جو بھی سمو دینا اُسے لفظوں میں
کبھی اوروں کی کہیں اپنی کہانی لکھنا

پہلے رکھ دینا چراغوں کو سرِ راہگذر
پھر کسی بیٹے مسافر کی کہانی لکھنا

چند اشعار سے کیا ہو گی تسلی تسنیم
لکھنے بیٹھی ہو تو اب ساری کہانی لکھنا

.....

آپ نے ملاحظہ فرمایا، کس بامعنی تخلیقی تازہ کاری کے وصف کے ساتھ شاعرہ نے بطور ایک کہانی کار، اپنی تخلیقی سمت نمائی کی طرف اپنے ہی شعروں کے ذریعے داخلی شہادت اپنے قارئین کے روبرو پیش کر دی ہے۔ گویا تخلیقی ''سرگوشی'' نے آگے بڑھ کر اور پھیل کر، کسی ارمان بھری صبح سے، کسی سہانی شام تک آتے آتے، کوئی یاد پرانی، کوئی اشکوں کی روانی، کوئی بہاروں کی جوانی، اپنے شعری بیانیے میں لفظوں کے تعلق سے یوں سمو دی

**نثار ترابی**

ہے کہ اس محبت بھری یاد آوری سے تخیل اور حقیقت کا ایک جہاں وجود میں آ گیا ہے۔ یادوں کے خاکے میں یوں رنگ بھرا ہے کہ گئے دنوں کی سرگوشی، ایک جیتے جاگتے بیانیے میں ڈھل گئی ہے۔ لفظ آواز میں، خیال تصویر میں اور تخیل منظر میں سمٹ آیا ہے۔

''سرگوشی'' میں حمد و نعت، سلام اور غزلیں شامل ہیں۔ ممتاز ادیب، محقق اور شاعر ڈاکٹر خواجہ زکریا نے ''سرگوشی'' کو رومانی شاعری کا منفرد مجموعہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''تسنیم کوثر نے اسے ایسے موزوں الفاظ اور عمدہ سطروں میں ڈھالا ہے کہ جذبات کی سچائی پڑھنے والے تک بخوبی منتقل ہو جاتی ہے، میرے خیال میں ''سرگوشی'' رومانی شاعری کا ایک عام مجموعہ نہیں بل کہ اپنی حدود کے اندر ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔''(۱)

جب کبھی خوش نما، خوش جمال لمحے، شامِ غم کے اوراق پلٹتے ہیں تو اُس کی آنکھوں میں گئی یادوں کی شاداب رُتوں کے کئی دلربا موسم اُترنے لگتے ہیں۔ راستے جدا کر لینے کے بعد لوگ وفاؤں کا میثاق بھول جاتے ہیں مگر اس کا شمار ہر حال میں وفا کیش جذبوں کی اسیری میں رہنے کو عشق کا حاصل سمجھنے والوں میں ہوتا ہے۔

چاہت کے جلترنگ بڑی دُور تک گئے
اپنی وفا کے رنگ بڑی دُور تک گئے

.....

تسنیم مل ہی جائے گی منزل بھی ایک دن
ہم لے کے یہ امنگ بڑی دُور تک گئے

شاعرانہ اظہار میں ابدی سچائیوں کی ترجمانی کیا خوب کی ہے:

اگر اجڑی ہوئی شاخیں ہوں کوئی پھول نہ پھل
ایسے پیڑوں پہ پرندے نہیں ٹھہرا کرتے

.....

نسائی کیفیات کے حامل یہ شعری رنگ ملاحظہ ہوں:

مجھ کو مسحور کیے رکھتی ہے خوشبو اُس کی
ہم نفس ہوتی ہے ہر شب کو چنبیلی میری

.....

اس کی یادوں سے مہکتا ہے سراپا تسنیم
شام خوش رنگ ہے اور صبح نویلی میری

.....

اس کے دل کی دھڑکن جس نام پر مچلتی ہے وہ ایوانِ جاں کا ایسا مکیں ہے، جس کے تصور سے اس کا مشامِ جاں مہکتا ہے، جس کی ہمدمی کا فیض ہے کہ رہگوارِ حیات میں اس کے دم سے اس کی صبح بھی فروزاں اور شام بھی تاباں ہے۔ وہ شخصی محبتوں کے تسلسل میں اور وارفتگی عرض وحال کے جملہ مظاہر میں ایک نوع کی وضع داری اور رکھ رکھاؤ کا چلن قائم رکھنے کو پاسِ وفا کا نام دیتی ہے۔ اسے صدقِ دل سے باہمی رشتوں کی استواری میں ہر مشکل آسان ہوتی ہے:

مشکلیں پیار کی آسان بھی ہو سکتی ہیں
صدقِ دل سے جو کوئی ساتھ نبھانا چاہے

.....

عصری بے چینی کا دکھ جہاں بھی منظوم ہوا ہے، بہت شدتِ خلوص سے منظوم ہوا ہے، مثلاً یہ ایک مصرع دیکھیے:

اے شدتِ احساس نہ کر اور پریشاں
اس شہر کے حاکم کو سنائی نہیں دیتا

پنجابی پتے کی ایک معروف کلی ہے:

کوئی مندری تو لے دی
جگ سارا جاندا اے
میں ساری آں ڈھولے دی

یہاں لفظ ''ساری'' نے اس پتے یعنی ''مامے'' کو فکری اور موضوعاتی اعتبار سے جو وسعت، دل پذیری اور جمالیاتی حظ کی دولت عطا کی ہے وہ کمال ہے۔ اسی طرح تسنیم کوثر کہتی ہیں:

یا تو پھر دور ہم سے ہو جائے
یا جو چاہت ملے وہ ساری ہو

.....

یہاں لفظ ''ساری'' کو قافیہ پیمائی کی مجبوری سے الگ ہو کر سمجھنے کی سعی کی جائے تو شعر میں لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

محاکات نگاری کا حسن ملاحظہ ہو۔ کیسے منظر بہ منظر خیال آرائی کے پیکر سجائے ہیں:

شام نے دھیرے دھیرے در کھولے
رات اتر آئی بال و پر کھولے

دل کے اجڑے ہوئے جزیرے میں
آس بیٹھی ہے اپنے پر کھولے

.....

اظہار کے نئے پن کی جھلک متعدد شعری مقامات پر ضو دیتی ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے بھی اور اسلوب کے اعتبار سے بھی۔ دیکھیے تخیل کی تازہ کاری سہل ممتنع کی خوبی کے باوصف حسنِ بیان کو کس خوبی سے چمکاتی ہے مثلاً:

دیے کو دل لگی مہنگی پڑے گی
ہوا سے دوستی مہنگی پڑے گی

مخالف پر بھروسا کر لیا ہے
اسے یہ سادگی مہنگی پڑے گی

خزاں بیٹھی ہے اب نظر جمائے
کلی کو بے خودی مہنگی پڑے گی

شاعرہ کا شعور شعرِ عزم و حوصلے اور خودداری و غیرت کے جذبوں کا ہم نوا ہے:

اب نہیں دوریِ منزل کا کوئی خوف ہمیں
آبلہ پائی کو سہنے کا ہنر جانتے ہیں

ہم نے کب تم کو بتایا ہے محافظ اپنا
کیسے کرنا ہے ہمیں اپنا سفر جانتے ہیں

.....

محمد حامد سراج تسنیم کوثر کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''تسنیم کوثر بھی ایسی مصنفہ ہیں۔ وہ شعر کہتی رہی ہیں، کہانیاں لکھتی آرہی ہیں۔ پھر اچانک ان کے اندر نے انگڑائی لی اور وہ سفرنامہ نگار کے طور پر سامنے آگئیں۔ تحریر یا تخلیق کے حوالے سے سفرنامہ اوپری چیز نہیں لیکن مشاہدے کی ندرت اور خیال کی تمازت کو ہم آہنگ کر لینے کا کمال بہت کم لکھنے والوں کو آتا ہے۔ تسنیم کوثر کے سفرنامے میں تغزل کا بانکپن بھی ہے اور کہانی کی جولانی بھی۔ اتنی دل پذیر نثر لکھنے کا ملکہ کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔''(۲)

اپنے جذبات و احساسات کی سرگوشی کو شعری اظہار کا روپ شاعرہ نے کیوں اور کیا سوچ کر عطا کیا۔ اس ضمن میں وہ کہتی ہیں کہ:

''خواب تو انسان عمر بھر دیکھتا ہے، کچھ خواب پورے ہو جاتے ہیں، کچھ ادھورے رہ جاتے

ہیں اور کچھ کرچی کرچی ہو کر بکھر جاتے ہیں۔ کرچی کرچی ہو جانے والے خواب لہو میں سرایت کر جاتے ہیں، بدن میں درد کی چنگاریاں بھر دیتے ہیں، کبھی ناسور بن کر پھوٹتے ہیں اور کبھی آنسو بن کر بہہ نکلتے ہیں۔(۳)

جب کہ یونس جاوید کا کہنا ہے کہ:

"تسنیم کوثر کی ایک دو اعلیٰ درجے کی خوبیاں، جنہیں میں کوشش کے باوجود اپنا نہیں سکا اس کا اختصار ہے اور اختصار بھی اس قدر متاثر کرنے والا کہ ہر جملہ تاثیر سے لبالب ہو جاتا ہے۔ وہ لفظ ضائع نہیں کرتی اور یہ بڑے قد آور لکھاریوں کی پہچان ہے "(۴)

جو قسمیں توڑ دیں تم نے سبب ان کا نہیں سننا
حسیں سرگوشیوں سے رنگ جیون میں نہیں بھرنا

.............................................

کوئی وعدہ نہیں لینا
کوئی وعدہ نہیں کرنا
ہمیں تم سے نہیں ملنا

یا پھر

یقیں پاؤں پسارے جھولتا ہے
بے یقینی کے کمند انداز جھولے میں
اڑانیں جب بھی بھرتا ہے
یہی سرگوشی کرتا ہے
جدا ہونے کا موسم آ گیا ہے

.............................................

بشریٰ رحمٰن ایسی معتبر اور نامور تخلیق کار نے تسنیم کوثر کو بنیادی طور پر ایک خوش ادا شاعرہ مانتے ہوئے کہا ہے کہ:

"اُن کے افسانوں میں کرداروں کا انتخاب انگوٹھی میں جڑے نگینوں کی طرح ہے۔ آپ کو یہ سب کردار اپنے اردگرد، ماحول کے اندر اور گھروں کے اندر نظر آئیں گے۔ مجال ہے کہ کسی کردار میں ذرا سا بھی جھول آیا ہو۔ یہ اُن کے گہرے مشاہدے اور انسانی نفسیات پر مکمل گرفت کی دلیل ہے(۵)

شاعرہ کے ہاں اظہار و فکر کی منظوم داستان یوں تو اپنے کئی عمدہ شعری کردار رکھتی ہے مگر اس داستانِ سخن سرائی کا ایک شعری کردار تو ایسا ہے جس نے اسے اظہار کے زندہ باد جہانوں سے ملا دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر تسنیم کوثر بطور شاعرہ اپنے دیگر شعری سرمایے کی بدولت اردو کی شعری دنیا کو کبھی یاد نہ بھی رہے تو بھی اس کے شعری سرمایے میں موجود اُس کی یہ تخلیقی کلی اس کے گلشن خیال کو سدا مہکاتی رہے گی، اور وہ کلی ہے:

ہم لوگ ترے شہر میں خوشبو کی طرح ہیں
محسوس تو ہوتے ہیں ، دکھائی نہیں دیتے

## حوالہ جات

(۱) "رومانی شاعری کا منفرد مجموعہ" خواجہ محمد زکریا مشمولہ "سرگوشی" سنگت پبلشرز لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۱۴

(۲) محمد حامد سراج "تسنیم کوثر کا شعری آسمان" مشمولہ، ماہنامہ بیاض، لاہور، مارچ ۲۰۱۷ء جلد نمبر ۲۵، شمارہ نمبر ۳

(۳) تسنیم کوثر، مشمولہ "سرگوشی" (شعری مجموعہ) سنگت پبلشرز لاہور، ۲۰۱۹ء

(۴) "ہارے میں لکھاری" یونس جاوید مشمولہ "چھجن" اردو اکیڈمی پاکستان لاہور ۲۰۱۷ء، ص ۱۲

(۵) توانا آواز "تازہ لہجہ" بشریٰ رحمٰن، مشمولہ "چھجن" افسانوی مجموعہ (تسنیم کوثر) اردو اکیڈمی پاکستان لاہور، ص ۱۰

☆☆☆☆☆

# عرفان صادق کی غزل کے چند نمایاں استعارے

عرفان صادق کا شمار نوے کی دہائی میں نمایاں ہونے والے شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''رتجگوں کی بارش میں'' 1997 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کے دیباچہ نگاروں میں جیلانی کامران اور شہزاد احمد کے نام شامل ہیں پہلے دیباچہ نگار جیلانی کامران جدید اردو نظم کے سب سے اہم شاعر ہونے کے ساتھ اپنے عصر کی تنقید کا بھی ایک اہم نام ہیں۔ شہزاد احمد کا شمار پاکستانی غزل کے قافلہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ یوں ایک نئے شاعر کی شاعری پر دو بہت سینئر اور اہم شاعروں کی آرا بتاتی ہے کہ انھوں نے نئے شاعر کے امکانات دیکھ لیے تھے۔ دوسرا مجموعہ ''چاند کی شال میں لپٹے وعدے'' 2002 میں شائع ہوا جس کے دیباچہ نگاروں میں خورشید رضوی جیسے عالم اور باکمال شاعر کا ہونا ان کی شاعروں کو اعتبار بخشتا ہے۔ تیسرا مجموعہ ''میں آنکھیں بھول آیا ہوں'' 2008 میں شائع ہوا جس کے دیباچے ستر کی دہائی کے اہم شاعر غلام حسین ساجد اور میرے ہم عصر نقاد ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے لکھے جبکہ فلیپ پر ڈاکٹر وزیر آغا جیسے اہم نقاد کی رائے تھی۔ ان کے علاوہ عرفان صادق کی شاعری پر احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد، اعزاز احمد آذر اور اختر شمار کی آرا بھی ان کی شاعرانہ حیثیت کی توثیق کرتی ہیں۔

عرفان صادق سے میری ملاقاتیں ادبی مجلسوں اور مشاعروں میں گزشتہ کئی برس سے جاری ہیں۔ وہ اپنے سینئرز کا احترام کرنے والے ایک بہت ہونہار شاعر ہیں۔ مشاعروں میں بھی ان کی شاعری کو پذیرائی حاصل رہتی ہے۔ ان کے مصرعے کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ سننے والا اس سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اس کے منہ سے بے اختیار واہ نکلتی ہے۔ وہ لاہور کی ادبی مجلسوں اور مشاعروں کا ناگزیر حصہ ہیں اور عموماً ان مجلسوں اور مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے ہیں۔

عرفان صادق ہمارے ان نوجوان شاعروں میں سے ہیں جو اپنی شاعری میں اپنے عہد سے منسلک رہتے ہوئے شعر کہتے ہیں۔ گزشتہ چار دہایوں سے پاکستان جن سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے گزر رہا ہے، انھوں نے ہمارے شاعروں کو سماجی مسائل سے جوڑ رکھا ہے۔ اب

ضیا الحسن

شاعر کسی خیالی سرزمین کے قصے بیان کرنے کے بجائے اپنے معاشرے کو درپیش خوف وخطر سے زیادہ نبرد آزما ہیں۔ فوری مسائل نے انھیں فکر و فلسفہ کو پس پشت ڈال کر اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔ یہ معاشرہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے جس میں دیگر طبقات کے ساتھ ادیب بھی شامل ہیں، خصوصاً 9/11 کے بعد دنیا اپنی تاریخ کے جس مرحلے میں داخل ہوگئی ہے، اس میں دہشت، خوف، درد، عذاب اور اجتماعی بے حسی نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں، چنانچہ شاعر بھی سارے معاشرے کے ساتھ انھی مسائل میں الجھ گئے ہیں۔ عرفان صادق بھی شاعروں اور ادیبوں کے اس قافلے کا حصہ ہونے کے ناطے اپنے تخلیقی تجربے میں انھی موضوعات کو پیش کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ترقی پسند ادیبوں کو ادب سے یہ شکوہ تھا کہ اس میں عہد کے زندہ مسائل بیان نہیں ہوتے۔ چنانچہ ترقی پسند نقادوں نے ادب کو سماجی زندگی کی طرف متوجہ کرنے کے لیے مسلسل لکھا۔ 1936 سے لے کر قیام پاکستان کے بعد تک ادب میں ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی یا ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی کشمکش جاری رہی لیکن 1977 کے مارشل لا کے بعد اس خطے سے آغاز ہونے والی تیسری غیر علانیہ عالمی جنگ نے دنیا کو ایک ایسے دور میں داخل کر دیا ہے جہاں انسان کا وجود ہی خطرے میں نظر آ رہا ہے۔ بقا کی حیاتیاتی خواہش نے اب اردو شاعروں کی بغیر کسی تحریک کے ایسے تربیت کی ہے کہ سماجی مسائل خود بخود ان کے شعری تجربے کا حصہ بن گئے ہیں۔ عرفان صادق بھی اسی ادبی ماحول کا حصہ ہیں، چنانچہ ان کی شاعری بھی غزل سے مخصوص رومانی موضوعات کے ساتھ سماجی موضوعات کا احاطہ بھی کرتی ہے۔

عصری موضوعات دو طرح سے شاعری میں اظہار پاتے ہیں۔ ایک براہ راست موضوع کی صورت اور دوسرا استعاروں کے ذریعے۔ استعاروں میں ظہور کرنے والا عصری اظہار وجدانی سطح پر تخلیق ہوتا ہے اور وجدانی سطح پر اس کی تاثیر قاری کو اپنے حصار میں لیتی ہے۔ گویا بات دل سے نکلتی ہے اور دل پر اثر کرتی ہے۔ موضوعات براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ استعاراتی عصری اظہار کو سمجھنے کے لیے عرفان صادق کا یہ شعر دیکھیے:

دکھوں کی انتہا ممکن کہاں ہے
یہ کیا رائے شماری ہو رہی ہے

.....

اس شعر کا موضوع دکھ ہے۔ دکھ سماجی عمل نہیں ہے بلکہ وجودی عمل ہے لیکن اس وجودی مسئلے کے بیان کے لیے شاعر نے جس لفظ کا انتخاب کیا ہے وہ خالص سماجی بلکہ سیاسی ہے۔ رائے شماری ایک سیاسی عمل ہے۔ جسے ایک وجودی مسئلے کے اظہار کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ دکھ شعوری طور پر قاری کو اپنا احساس دلا رہے ہیں لیکن لاشعوری طور پر وہ شاعر کے معاشرے اور اس معاشرے کے سیاسی نظام سے آگاہ ہو رہا ہے۔ یہ شعر کسی جمہوری ملک کے جمہوری دور میں ہی لکھا جا سکتا ہے۔ پاکستان جیسے مارشل لاؤں کی زد میں آئے ہوئے ملک میں

اس شعر کا ظہور بتاتا ہے کہ یہ ایک ایسے دور میں تخلیق ہوا ہے جب معاشرے میں جمہوری عمل جاری ہے۔ شاعر کی باطنی دنیا استعارے کے ذریعے اپنے عہد کی صورت حالات کو منکشف کر رہی ہے۔ استعارے کی یہی خوبی ہے کہ اس کے ذریعے شعر موضوع سے زیادہ معانی کو پھیلاتا چلا جاتا ہے۔

عرفان صادق کی شاعری میں بھی بعض استعارے تواتر سے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ استعارے مختلف موضوعات کو بیان کرنے کے لیے برتے گئے ہیں لیکن مجموعی طور پر شاعر کے معاشرے اور معاصر زندگی کو اس طرح پیش کرتے ہیں جس طرح وہ شاعر کے تصور میں ہیں۔ یہ استعارے بظاہر مختلف اور بہ باطن ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ بعض استعارے براہِ راست ہیں مثلاً درد، غم، اداسی، دہشت، وحشت اور خوف وغیرہ۔ بعض استعارے بالواسطہ ہیں جیسے آنکھیں، حیرت، آئینہ، دھوپ، چراغ اور خواب وغیرہ۔ بعض استعارے ان کے عہد کی صورت حالات کو پیش کرتے ہیں اور بعض استعارے اس صورت حالات سے نکلنے کی آرزومندی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان تمام استعاروں سے شاعر کے عہد کی مجموعی فضا کا اظہار ہوا ہے۔ اس عہد کے مسائل، مصیبتیں، عذاب، آرزوئیں اور خواب سب ہی ان استعاروں کے ذریعے قاری کے وجدان کو لاشعوری طور پر متاثر کرتے ہیں۔ ہر استعارہ متنوع موضوعات کو پیش کرتا ہے لیکن قاری کے لاشعور میں اس کے عہد کے حالات و معاملات کو بھی نقش کرتا جاتا ہے۔ پہلے عرفان صادق کے ان استعاروں کو دیکھتے ہیں جو ان کے عہد کی مجموعی فضا کو براہِ راست پیش کرتے ہیں۔

وہی تو اصل میں ہے غم شناس مٹی کا
بدن پہ پہنا ہے جس نے لباس مٹی کا

اک عجب خوف اُمڈ آتا ہے دروازوں سے
رات ہوتی ہے تو بھر جاتا ہوں آوازوں سے

چلی ہے شہر میں کچھ ایسے بے حسی کی ہوا
جو اہلِ درد ہیں آنکھوں کو نم کیے جائیں

.....

شبِ فراق ترے بین کس طرح سن لوں
مری ہے دشمنی اندھی ہوا سے پہلے ہی
مجھے ڈرائیں گی کیا وحشتیں زمانے کی
گھلا ملا ہوں میں دشتِ بلا سے پہلے ہی
اداسی کی مدھر تانوں پہ ہر پل
کہوں کیا دل یہ کتنا ناچتا ہے

جب تلک درد کے پاتال میں اترے نہیں تھے
لفظ خوشبو نہ ہوئے، سوچ چنبیلی نہ ہوئی

.....

ان استعاروں میں عرفان صادق کے اس مجموعے میں درجنوں اشعار شامل ہیں جن میں سے چند منتخب اشعار اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ ان اشعار میں کہیں بھی براہِ راست معاشرے میں پھیلے ہوئے غموں، دردوں، آہوں، بے حسی، خوف، وحشت، اداسی اور بین کا ذکر نہیں ہے بلکہ ہر شعر الگ ہی کسی موضوع کو پیش کرتا ہے لیکن مجموعی طور پر معاصر معاشرتی صورت حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ مثلاً دوسرے شعر میں کسی تجریدی کیفیت کے ابھرنے سے پیدا ہونے والے خوف کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن یہ استعارہ ہمارے زمانے میں ہر طرف پھیلے خوف کی

طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ شاعر بعض مخصوص استعارات کو اسی زمانے میں استعمال کرتے ہیں جو اس زمانے کی زندگی سے پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ وہ موضوع سے الگ اس زمانے کی سماجی صورت حال کو بیان کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا منتخب اشعار میں استعمال ہونے والے سارے استعارے ہمارے عہد کی زندگی کے نمائندہ ہیں اور اس زندگی کو بہترین انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس زندگی کو انھوں نے دھوپ کے بالواسطہ استعارے میں بھی پیش کیا ہے۔

دھواں بارود کا روکو خدارا
ہماری دھوپ کالی ہو رہی ہے

ہم دھوپ کو اوڑھے ہوئے پہلو میں کھڑے ہیں
سایہ کہاں رکھ آئے ہو چھتنار درختو

میں ایک دھوپ ہوں جلتے ہوئے زمانوں کی
تو ایک شام، ترا سُرمئی تعارف ہے

ہمارے بالوں میں بچپن سے دھوپ اتری ہے
ہم ایک قریہ بے سائباں کا حصہ ہیں

پھر کوئی دشتِ جنوں میں ہمیں لے آیا ہے
پھر کڑی دھوپ میں ہم آبلہ پا بیٹھے ہیں

مرے مزاج میں ٹھنڈک ترے مزاج میں دھوپ
میں جانتا ہوں ترے ساتھ چل سکوں گا نہیں

ہر طرف دھوپ کی دیوار نظر آتی ہے
اک ذرا سایۂ دیوار سے کیا ہونا ہے

.....

ان کی نسبت سے کڑکتی دھوپ جھلساتی نہیں
رحمتوں کی سر پہ رہتی ہے گھٹا آٹھوں پہر

ان تمام اشعار میں دھوپ کہیں براہِ راست اس سخت زندگی کا استعارہ ہے جو ہمارے اردگرد بکھری ہے اور کہیں کسی اور موضوع کی پیش کش کرتا ہے اور پس منظر میں اپنے عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ ان استعاروں کے ساتھ عرفان صادق کے اس مجموعے میں وہ استعارے بھی بہت ملتے ہیں جو ان کے عہد کے تقریباً ہر شاعر کے مجموعے میں کثرت سے ملتے ہیں یہ استعارے خواب، چراغ اور آئینہ ہیں، آئینے کی مناسبت سے حیرت اور حیرت کی مناسبت سے آنکھ ہے۔ خواب کا استعارہ تو اردو شاعری میں قیام پاکستان سے قبل آزادی کی تحریکوں کے ساتھ ہی پیدا ہو گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد سیاسی و سماجی حالات کے ساتھ ساتھ اس استعارے کی معنویت میں بھی تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ موجودہ حالات میں خواب کا استعارہ زندگی کو کیسے پیش کرتا ہے، عرفان صادق کے اس مجموعے سے چند منتخب اشعار دیکھیے:

کسی تعبیر کی حسرت میں جلتے
مرا ہر خواب مرتا جا رہا ہے

مری آنکھوں کی یہ حیرانی گواہی دے گی
خواب دفنائے ہیں، لفظوں میں ریاضت نہیں کی

اٹھائے پھرتے ہیں سرسبز خواب آنکھوں میں
ہمارے حصے میں اڑتا ہوا غبار آیا

خواب روشن نہ ہوئے، نیند سہیلی نہ ہوئی
شاد آباد کبھی دل کی حویلی نہ ہوئی

.....

یہ چار شعر پہلی بارہ غزلوں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ ان شعروں میں خواب جن حالتوں میں نظر آتا ہے، باقی غزلوں میں بھی اس کا اظہار ایسے ہی ہوا ہے۔ پہلے شعر میں خواب مرتا جا رہا ہے، دوسرے شعر میں خواب دفنایا گیا ہے، تیسرے شعر میں سرسبز خوابوں کے بدلے میں اڑتا ہوا غبار ملا ہے اور چوتھے شعر میں خواب روشن نہ ہونے کی بات کی گئی ہے۔ تین طویل مارشل لاؤں اور مارشل لاؤں جیسی جمہوریت، شدید سماجی، سیاسی اور معاشی انتشار، نیو کلونیل صورت حالات، تیسری غیر اعلانیہ عالمی جنگ، چوری، ڈاکے، قتل، بم دھماکے، خودکش حملے اور دہشت گردی نے اس پاکستانی سماج کو جس مقام تک پہنچا دیا ہے، اس میں خواب زندہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ دیگر ہم عصر شاعروں کی طرح عرفان صادق کی شاعری میں بھی ٹوٹے ہوئے اور مرے ہوئے خواب ہیں۔ ایک یہی استعارہ ہمارے معاصر سماجی حالات کی عکاسی اور تجزیے کے لیے کافی ہے۔ اس کے ذریعے اردو شاعری کا قاری اپنی حالت اور حالات دونوں سے کماحقہ آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ خوابوں سے تہی اس معاشرے میں لوگ کس طرح محض چلتی پھرتی ہوئی لاشوں میں تبدیل ہوئے ہیں اور زندگی سے محروم ہوئے ہیں، اس کا اندازہ اس استعارے کے استعمال سے اچھی طرح کیا جا سکتا ہے، ان کی شاعری میں حیرت، آئینہ، آنکھ اور چراغ، استعاروں کا ایک مربوط سیٹ ہے جس میں ہر استعارہ دوسرے سے مربوط ہے اور اس ربط کا شاعر کو شعوری طور پر بھی احساس ہے جس کا پتہ اس بات سے لگتا ہے کہ ان میں سے ہر استعارہ الگ سے استعمال ہونے کے ساتھ ہر دوسرے استعارے کے ساتھ بھی آیا ہے۔

مری آنکھوں کی یہ حیرانی گواہی دے گی
خواب دفنائے ہیں، لفظوں میں ریاضت نہیں کی

.....

بڑھنا ہے روشنی کو یونہی خال و خد کے ساتھ
ہم تو بندھے ہوئے ہیں چراغِ ابد کے ساتھ

مری آنکھیں بھی اس کو جانتی ہیں
معتقد اس کا آئینہ ہی نہیں

مجھے حیرتوں کے جہان میں ہے رکھے ہوئے
یہ جو آئنوں کی قطار ہے مرے چار سو

.....

آئنے دھندلا گئے، مہتاب پانی ہو گئے
سامنے آنکھوں کے اپنے خواب پانی ہو گئے

ان استعاروں کو بنیاد بنا کر کہے گئے درجنوں اشعار میں سے چند اشعار میں نے یہاں نقل کیے ہیں۔ پہلے شعر میں آنکھ، حیرانی اور خواب، دوسرے شعر میں روشنی اور چراغ، تیسرے شعر میں آنکھ اور آئینہ، چوتھے شعر میں حیرت اور آئینہ اور پانچویں شعر میں آئینہ، آنکھ اور خواب اکٹھے استعمال ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان استعاروں میں کوئی باطنی ربط موجود ہے اور ان استعاروں کا اپنے معروض سے بھی کوئی باطنی ربط موجود ہے۔ آنکھ، حیرت اور

آئینے کا تعلق تو کلاسیکی ہے اور صدیوں سے اردو فارسی شاعری میں مستعمل ہے۔ چراغ کا استعارہ خاص طور پر ضیا الحق کے مارشل لا کے بعد اردو غزل میں تواتر سے آیا ہے لیکن ان چاروں کا تعلق اپنے گرد و پیش کی زندگی سے بہت گہرا ہے۔ ہماری کلاسیکی شاعری میں آئینہ کائنات کا استعارہ ہے اور آئینے سے حیرت کا تصور جڑا ہوا ہے کیوں کہ محبوب کا حسن ایسا بے پناہ ہے کہ آئینہ بھی اسے دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے لیکن جدید شاعری میں آئینہ شناخت کی گمشدگی اور آرزؤں کا استعارہ ہے کیونکہ ہمارے عہد میں ہجوم کے درمیان ہر شخص اپنی انسانی شناخت سے مجروح ہے اور اس کا جویا ہے۔ چراغ اس عہد ظلمت کی عکاسی اور روشنی کی آرزومندی کا استعارہ ہے اور آنکھیں: خوابوں، روشنی اور حسن کو ترسی ہوئی آنکھیں ہیں، توازن، تناسب عدل اور ترتیب کی حسرت کا شکار، خوابوں سے تہی اور زندگی سے خالی آنکھیں ہیں۔ اب ان استعاروں اور ان کی معنویت کو پیش نظر رکھ کر آپ عرفان صادق کی شاعری کا مطالعہ کیجیے، آپ کو محسوس ہوگا کہ معانی کئی سطحوں پر خود کو منکشف کر رہا ہے۔

عرفان صادق کے شعری استعاروں کی اس بحث کو میں ایک آخری استعارے دعا پر مکمل کرتا ہوں، دعا ہمارا تہذیبی لفظ اور تصور ہے اور ہر دور کی شاعری میں خال خال لیکن لازماً ملتا ہے گزشتہ تیس برس کی شاعری میں یعنی ضیا الحق کے مارشل لا کے بعد جوں جوں جہاد اور دہشت گردی میں اضافہ ہوتا گیا ہے، پاکستانی معاشرہ غیر محفوظ اور بے امان ہوتا گیا ہے، اور اس استعارے کا استعمال بھی زیادہ ہوتا گیا ہے۔ یہ استعارہ ہماری ناتوانی، نااہلی، سستی، کاہلی، زندگی سے بے پرواہی بزدلی اور بے عملی کا استعارہ بھی ہے اور اس حالت سے نکلنے کی آرزومندی کو بھی پیش کرتا ہے۔

اتنے مایوس ہو گئے ہیں لوگ
اب لبوں پر کوئی دعا ہی نہیں

عجیب زہر سا بھرنے لگا ہے سانسوں میں
سروں پہ رہ گئے رکھے ہوئے دعا کے ہاتھ

یہ آنسوؤں میں گندھی التجا تماشا ہے
مجھے تو لگتا ہے دست دعا تماشا ہے

.....

اگر صرف ان اشعار میں دعا کی معنویت پر غور کر لیا جائے تو آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہم اس منزل پر آ گئے ہیں جہاں یا تو لبوں پر دعا بھی نہیں رہی اور اگر ہے بھی تو بس تماشا بن گئی ہے۔ اب مسجدوں میں ہر جمعہ کے بعد ہونے والی امن کی دعاؤں اور ان دعاؤں کے بعد روز افزوں بدامنی دہشت گردی اور افراتفری کا تجزیہ کریں تو صاف پتہ چل جائے گا کہ شاعر دعا کو تماشا کیوں کہہ رہا ہے۔

عرفان صادق کے اس مجموعے میں اور بھی کئی استعارے وضع کیے گئے ہیں۔ یہ دیباچہ صرف ایک اشارہ ہے کہ کس طرح شاعری کے استعاروں کو دریافت کرنا، ان کی معنویت کا تعین کرنا اور شاعری پڑھنے کی تہذیب پیدا کرنا چاہیے کیوں کہ شاعری بہر حال وہ فن نہیں ہے جس سے سرسری گزرا جا سکتا ہو۔

☆☆☆☆☆

# کتاب: منطقات ـــ مصنف: جمیل احمد عدیل

اس کتاب کا انتساب جمیل احمد عدیل نے اپنے پیارے دوست سونان اظہر کے نام کیا ہے۔

منطقات ایک منفرد ، دیدہ زیب، خوبصورت سرورق والی ضخیم کتاب ہے۔ جب مجھے یہ اپنے مقالے کے لیے درکار تھی تو میں نے جمیل احمد عدیل صاحب سے گزارش کی ۔ انھوں نے میرے مطلوبہ مضامین پر نشان تک لگا کے میرے لیے بھیج دی۔ بہت اچھے انسان ہیں، اعلیٰ اخلاق کے حامل، صاحبِ علم اور فہم و فراست والے وضع دار ادیب اور نقاد لیکن بہت سادہ مزاج بھی۔ کبھی بات کرنی مشکل نہیں لگی اور کبھی بھی بات کر کے مایوسی نہیں ہوئی۔ نہایت مرصع نثر لکھتے ہیں لیکن کچھ بھی پوچھ لیں بہت ہی تفصیل سے اور آسان جواب دیتے ہیں۔

منطقات نواکتوبر دو ہزار اکیس میں شائع ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر معین نظامی، ڈاکٹر محمد افتخار شفیع اور مصنف خود ''حرفے چند'' کے عنوان سے مضامین شامل ہیں۔

جو مضامین فہرست میں شامل ہیں۔ وہ دیکھ لیجیے ۔ایک زمانہ ختم ہوا۔۔۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیئر کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس پر تنقیدی مضمون پوسٹ ماڈرن درویش کی جانب سے ایک برگِ سبز، دھوپ عہد کے افسانے، ''شجر سایہ دار'': ایک شذرہ، اکرم کنجاہی اور محاسن فکر و فن، خود نوشت سوانح عمری: چند معروضات، یہ نثر ہے یا شعاعوں کا رقص، طرز یوسفی میں خطبہ لکھنا، جاوداں کہانیاں، عریاں حقیقت میں مضمر افسانے،

ثمینہ سیّد

علامہ اقبال اور جواہر لال نہرو، جل پری اور سعود عثمانی کی جادوگری، مغربی آزادیٔ اظہار کے شاخسانہ، سورج کے پھول، دلنواز و دلآویز، محبت زندگی ہے، سخن گو شاہدہ دلاور شاہ دانعتیہ روپ۔ اس کے بعد اکیس ادبی کالم، سولہ شخصی خاکے، پانچ افسانوں کے تجزیے، سات خطوط، کالم کہانی -- چھٹا گلاس نکاہیہ اور یہ کتابیں، یہ کتابیں--- یہ چار سو چوبیس صفحات پر مشتمل خزانہ ہے جس سے اردو ادب کے طالب فیض پا سکتے ہیں۔

یہ کتاب پڑھتے پڑھتے مجھے تو اپنا آپ ایک طفل مکتب ہی لگا۔ یقین کریں چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ایسی اعلیٰ اور مرصع نثر کہ طبیعت خوش ہو گئی۔

ڈاکٹر معین نظامی لکھتے ہیں:

''جمال و اعتدال کی زیبائی اگر تخلیق اور تحقیق کے ابریشمیں پیکر میں مجسم ہو کر خوش سلیقگی سے خودنما ہو تو سامنے دل و نظر کی خیرگی و سرشاری بدیہی اور فطری امر ہے۔ جمیل احمد عدیل کی فکر افروز اور دل انگیز علمی، ادبی اور تحقیقی تحریریں تاثیر و تسکین کا ایسا ہی حنارنگ ایوانِ خاص ہیں۔''

اب میری رائے بنتی ہی نہیں ------ یہ کتاب آپ کے پاس ہونی چاہیے بس۔

جمیل احمد عدیل صاحب کی دیگر کتابوں کے بارے میں کچھ باتیں:

کتاب بہترین دوست اور ہمراز ہے۔ کتاب کی اہمیت اور افادیت کسی بھی دور میں کم نہیں ہوئی۔ ختم ہونا تو بعید از قیاس ہے۔ دورِ جدید کے تقاضوں نے کتاب پڑھنے والوں کی توجہ کو متزلزل کیا لیکن ختم نہیں کر سکے۔ کچھ ہی وقت میں بینائی سوشل میڈیا پر کتاب ڈھونڈنے اور پڑھنے سے اوب گئی۔ اصل مزہ اور احساسِ زندگی تو کتاب کے لمس میں نہاں ہے۔ اور لمس کے احساس سے نظر چرانا ممکن ہی نہیں۔ دورِ حاضر کے بہترین نثر نگار اور نظم کے شاعر۔ اس سب سے بڑھ کر سنجیدہ اور زیرک نظر نقاد جناب جمیل احمد عدیل کی کتابیں مجھے موصول ہوئی ہیں گویا خزانہ ہاتھ لگ گیا۔ بہت اشتیاق تھا کہ جن کے بارے میں ہر ادبی حلقے کی رائے نا صرف مثبت ہے بلکہ محبت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کی تمام تحریریں میں بھی پڑھوں۔ وقت شنید تھا شاید۔ کتابیں جب میں نے سنگِ میل سے جا کر وصول کیں تو مجھے خواب آگیں سی کیفیت نے گھیر لیا۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا سنگِ میل کی ساری کتابیں بانہوں میں بھر کر بھاگ جاؤں۔ لیکن.....اے حسرت ناکام ذرا ایک نظر دیکھتے ہیں سینئر ز ادباء اور نقاد جناب جمیل احمد عدیل کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ آپ کا دل بھی کتابوں کے حصول کی رغبت اور حسرت سے بھر جائے گا۔ مضطرب ہو کر کوئی صورت نکالیں گے کہ یہ کتابیں آپ کے ہاتھ میں بھی جلد از جلد آئیں۔

''ھاویہ'' کے متعلق ڈاکٹر سید شبیہہ الحسن یوں رقمطراز ہیں۔

''جمیل احمد عدیل کیا فسانوں کا یہ مجموعہ اردو ادب کے شائقین کے لیے فکری اور فنی ہر سطح پر ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔ میرے خیال میں ''ھاویہ'' ان کے گزشتہ سے پیوستہ تخلیقی سفر کا شیریں ثمر ہے۔

جمیل احمد عدیل کے تمام افسانوی مجموعوں اور خصوصاً ''ھاویہ'' میں دونوں قسم کی کہانیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ وہ ظاہری آنکھوں سے نظر آنے والے معاشروں اور کرداروں کو بھی پیش کرتے ہیں اور چشمِ تخیل سے دکھائی دینے والے سماج کو بھی پیش کرتے ہیں۔''

جناب افتخار مجاز ہم میں موجود نہیں ہیں ڈاکٹر سید شبیہہ الحسن بھی اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکے لیکن اپنے لفظوں میں زندہ ہیں اور ہمارے دلوں میں بھی۔

''ھاویہ'' کے بارے میں کہتے ہیں:

''آپ یقین کریں کہ جب میں برادرِ عزیز جمیل احمد عدیل کی کہانیوں کا مسودہ ''ہاویہ'' پڑھ رہا تھا تو مجھے دورانِ مطالعہ مذکورہ بالا تمثیل رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ اور زیرِ خواندگی کہانیوں کے موضوعات و کردار پڑھتے ہوئے جمیل احمد عدیل مجھے عین میں اسی سنگ تراش مجسمہ ساز جیسے لگ رہے تھے جو یہ کہانیاں تخلیق کرتے ہوئے معاشرے میں ہمارے ارد گرد پھیلے ہوئے کرداروں اور واقعات کے خام مواد کو اولاً جمع کر کے آفرینا ثانیاً فاضلات کو منہا کر کے بے حد خوب صورتی، کامیابی اور مہارت سے انہیں کہانی کا روپ دے لیتے ہیں جبکہ ہم وہیں پہ ہونے کے باوجود ان موضوعات کی Potential worth اور کرداروں کے Weightage حتیٰ کہ ان کی موجودگی کا ادراک نہیں کر پاتے''

جناب ممتاز مفتی اردو ادب کا پسندیدہ ترین نام جمیل احمد عدیل کی کتاب ''بیتا ہوا مستقبل'' کے بارے رائے دیتے ہیں کہ:

''جمیل احمد عدیل آندھی کی طرح آیا اور چھا گیا۔ میں خوف زدہ ہو گیا کہ یہ ''سکندر'' کہاں سے آ گیا؟

جمیل احمد عدیل ایک فلسفی ہے فلسفی ایک وقار بھرا لفظ ہے۔ وقار بھرے لفظ سے کہتے نہیں چھپاتے ہیں۔ مطلب ہے سوچوں کا مارا ہوا عدیل۔ سوچوں کا مارا ہوا فرد ہے۔

جمیل احمد عدیل دو آتشہ ہے۔ سوچوں کے ساتھ ساتھ اس کی حسیات میں بھی شدت ہے۔ سیانے کہتے ہیں دونوں میں شدت ہو تو انسان پھانسی پر لٹک جاتا ہے۔ سوچیں اور محسوسات دو سوکنیں ہیں۔ دونوں میں ہر وقت ٹھنی رہتی ہے۔ عدیل کا بند بند پھانسی پر لٹکا رہتا ہے۔''

''نئے ستارے نیا آسمان'' میں ڈاکٹر اشفاق احمد ورک لکھتے ہیں۔

''بلاشبہ لمحہ موجود میں جمیل احمد عدیل اردو

ادب کا وہ خوبرو جوان ہے جس کے اندر احساسات و جذبات کے متعدد چشمے پھوٹے پڑتے ہیں اسے خدا تعالیٰ نے تخیل کی بے پناہ دولت سے بھی مالا مال کر رکھا ہیاور اظہار تخیل کی خوب صورت پرکاری بھی عطا کر رکھی ہے۔''

''فکشن کا شہزاد'' ڈاکٹر غافر شہزاد کا افسانوی ادب :ایک جائزہ ایک نایاب کتاب ہے۔ میری بہت بڑی خواہش تھی کہ یہ کتاب ورق ورق پڑھوں۔ اس کے بارے خود جمیل احمد عدیل کہتے ہیں۔

''جامعاتی تحقیق کے مظہر اس مقالے کی تسوید کے دوران دو معیارات قلب و ذہن میں برابر تراز ور ہے:

* نگرانِ مطالعہ کی ژرف بیں نظر کس حد تک مطمئن ہو پائے گی؟

زیرِ تحقیق شخصیت اس مجموعہ سے کیا تاثر قبول کرے گی؟

کہ دونوں اصحاب علمی دنیا میں غیر معمولی مقام و مرتبہ کے مالک ہیں. چناں چہ ان استفہامات نے جس عملِ سیمیا کو مسلسل نصیب بنائے رکھا۔ اس کے نتیجے میں تحریری مواد کا دو تہائی اول الذکر کی خاطر مسترد کر دیا اور ایک چوتھائی ثانی الذکر کو فرض کر کے منہا کر دیا. راقم اگر ریاضی میں طاق ہوتا تو شاعر ہونے کی آرزو کب کی پوری ہو چکی ہوتی۔ لہٰذا ایڈٹ ہونے کے بعد جو باقی بچا ہے - اس کا عددی / اقلیدسی جواب مہیا کرنے سے یکسر قاصر ہوں۔

تاہم جو شیرازہ بند ہوا ہے اسے 'بغیر حساب' پیش کیا جا رہا ہے.....گر قبول افراد.....!!

جمیل احمد عدیل_ ایسی محبتی اور قدر شناس شخصیت کے حامل انسان کی تحریروں میں بھی بلا کی شفافیت ہے۔ بیان ایسا ہے کہ شخصیت گویا آئینے کے روبرو ہے۔

''تفرید'' کے بارے جناب جمیل احمد عدیل کا کہنا ہے:

''اس مجموعے کا عنوان: ''تفرید'' اور ذیلی عنوان: ''چند تحریریں'' ہے۔

ہوسکتا ہے کوئی بہت ہی دراک نظر اس میں پیراڈوکسی تلاش کر لے۔ لیکن راقم کی رائے میں یہ صورت حال بعد یا تناقض سے دوری پر واقع ہوگی کہ 'لفظ' وہ بنیادی اکائی ہے جو وحدت کی ترجمانی کے لئے کافی ہے - نیز علم اور ادب جداگانہ منطقوں کے باوجود مشترک سرحد رکھتے ہیں۔ یعنی اس مجموعے میں زیادہ تر نگارشات ادبی موضوعات سے ربط رکھتی ہیں۔ چند تحاریر فکری و نظری یا علمی جہات کی پیش کار ہیں۔''

یہ تو ہے جناب جمیل احمد عدیل کی کتابوں سے آپ کو متعارف کروانے اور ان کے بارے میں احبابِ ذی وقار کی قیمتی آرا سے شناسا کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش تھی۔

نیک خواہشات۔

☆☆☆☆☆

# صدیقہ بیگم پاکستانی اور صدیقہ بیگم ہندوستانی

صدیقہ بیگم لاہوری | صدیقہ بیگم سیوہاروی

صدیقہ بیگم کا نام اہل ادب کے لیے یقیناً کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے لیکن قابل توجہ معاملہ یہ ہے کہ دنیائے اردو ادب سے وابستہ صدیقہ بیگم نام کی دو بہت ممتاز اور معروف شخصیات ہیں۔ ایک صدیقہ بیگم کا تعلق ہمسایہ ملک بھارت سے ہے جبکہ دوسری صدیقہ بیگم کا تعلق پاکستان سے ہے۔ جبکہ سن ولادت کو مدنظر رکھا جائے تو دونوں کا تعلق برٹش انڈیا یا متحدہ ہندوستان سے بنتا ہے۔ بہت سے لکھنے والوں نے دونوں شخصیات کے کوائف کو گڈ مڈ کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اردو ادب کی سب سے بڑی ویب سائیٹ ریختہ پر بھی جو معلومات دستیاب ہیں وہ صدیقہ بیگم پاکستانی کی تصویر کے ساتھ ہیں اور معلومات میں تاریخ ولادت صدیقہ بیگم ہندوستانی کی جبکہ تاریخ وفات صدیقہ بیگم پاکستانی کی درج ہے۔ یہی نہیں بلکہ ریختہ پر تو صدیقہ بیگم پاکستانی کے بلاگ میں ادب لطیف کے مختلف شماروں کو صدیقہ بیگم کی مرتبہ کتب کے طور پر جبکہ صدیقہ بیگم سیوہاروی (ہندوستانی) کے افسانوں کے مجموعوں کو صدیقہ بیگم پاکستانی کی تصانیف کے طور پر پیش ڈسپلے بلکہ اپ لوڈ کیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ٹائٹل یا کور پیج پر صدیقہ بیگم پاکستانی کی تصویر کے ساتھ یہ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ صدیقہ بیگم 1952-2019 لاہور۔ پاکستان۔ معروف افسانہ نگار اور مشہور ادبی جریدے ادب لطیف کی مدیر۔ بیشک اس میں لاپرواہی ریختہ کو معلومات فراہم کرنے والے کی ان کی بھی ہوسکتی ہے اور نااہلی بھی۔ لیکن اس سے یعنی ریختہ سے قطع نظر جن لکھنے والوں کے ماخذات معتبر نہیں ہیں ان کی تحریروں میں بہت سی غلط اور من گھڑت معلومات

ظفر معین بلے جعفری

پر مشتمل مواد بھی شامل ہے۔ لکھنے والوں میں سے کچھ کا تعلق تحقیق، تصنیف اور تنقید سے بھی ہے۔ ہمارے لیے انتہائی قابل احترام ایک بہت اچھی شاعرہ، ادیبہ اور ڈاکٹریٹ ڈگری یافتہ خاتون نے صدیقہ بیگم پاکستانی کے حوالے سے اپنی تحریر میں مکتبۂ ادب لطیف اور دیگر اشاعتی و تعلیمی اداروں اور ماہنامہ ادب لطیف لاہور کے بانی سرسید لاہور اور محسن ادب جناب چوہدری برکت علی کی تاریخ وفات انیس سو اسی یا اکیاسی درج کر کے وضاحت فرمائی کہ چوہدری برکت علی کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی صدیقہ بیگم نے ادب لطیف کی مدیر اعلیٰ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ہم نے محترمہ کو فیس بک میسنجر پر پیغام بھیجا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے میسنجر بلاک کر رکھا ہے۔ پھر ہم نے کو مینٹس میں گزارش کی اس تحریر کے حوالے سے ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں تو جواب ملا کہ تحریر پر کومینٹس بوکس میں ہی فرما دیجیے۔ ہم نے بصد احترام کومینٹس بوکس میں گزارش کی کہ جناب چوہدری برکت علی کا وصال انیس سو باون میں ہوا تھا لہٰذا آپ اپنی تحریر میں درست تاریخ وفات درج فرما دیں۔ موصوفہ نے جواباً فرمایا کہ ہماری معلومات کے مطابق چوہدری برکت علی کی یہی تاریخ وفات ہے۔ آپ فکرمند نہ ہوں---

اس واقعے کے بعد پروفیسر جناب غلام شبیر رانا صاحب کا مضمون صدیقہ بیگم: وہ جو چپ چاپ بھری بزم سے اٹھ کر چل دیں۔ شائع ہوا۔ اس مضمون میں صدیقہ بیگم کا سال ولادت انیس سو پچیس بتایا گیا ہے۔ جو کہ غلط ہے۔ چند دیگر معلومات پر بھی ہمارے تحفظات ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نوعیت کے اور بھی متعدد قابل توجہ معاملات ہیں کہ جن میں سدھار لانے کی اشد ضرورت ہے۔

نامور افسانہ نگار صدیقہ بیگم سیوہاروی ہندوستانی کی انیس سو پچیس میں لکھنؤ میں ولادت ہوئی اور ستمبر دو ہزار بارہ کو علی گڑھ میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنی زندگی بجنور، الہ آباد اور علیگڑھ سمیت مختلف شہروں میں گزاری۔ ان کا تعلق بھی ترقی پسند مصنفین سے تھا۔ ادب لطیف، نقوش، شاہراہ اور دیگر رسائل و جرائد میں ان کے افسانے تواتر سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی ہندوستانی کے افسانوں کے مجموعے ہچکیاں، دودھ اور خون، پلکوں میں آنسو، ٹھیکرے اور رقص بسمل قابل ذکر ہیں------

آیئے اس حوالے سے مزید اظہار خیال سے قبل ہم صدیقہ بیگم پاکستانی لاہوری کے سوانحی خاکے پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ صدیقہ بیگم کا سوانحی خاکہ ——

نام: صدیقہ بیگم _ گھریلو نام: رانی
مقام و تاریخ ولادت۔ یکم جنوری 1938

والد کا نام: چوہدری برکت علی
(المعروف سرسید لاہور)
(1902 ولادت__ 1952.. وفات)
والدہ کا نام: عنایت بیگم
(1915 ولادت__ 1992... وفات)
چوہدری برکت علی اور عنایت بیگم کی اولادیں
سعیدہ بیگم
(1932 تا 2015)
چوہدری افتخار علی
(1933 تا 2019)
چوہدری ظفر علی
(1936 ولادت_2021 وفات)
چوہدری خالد علی
(1938 ولادت)
صدیقہ بیگم
(1938 تا 2019)
چوہدری اکبر علی
(1942)
پروین عرف ناہید
(1944)

صدیقہ بیگم نے 1954 میں مدرسہ البنات۔ نزد چوبرجی لاہور سے میٹرک کی سند حاصل کی انٹرمیڈیٹ۔ اسلامیہ گرلز کالج کوپر روڈ سے 1956 میں کیا۔
صدیقہ بیگم کی شادی معروف بینکار جاوید طارق خان صاحب سے 1958 (کراچی) میں ہوئی۔

---

صدیقہ بیگم اور جاوید طارق خان کے گلشن میں تین پھول کھلے
ثویلہ زوجہ انیس احمد خان
توصیف احمد خان
بیاء زوجہ آغا بابر خان

---

ادبی اولاد — صدیقہ بیگم کے بڑے داماد (فرزند اشفاق احمد خان صاحب اور بانو قدسیہ صاحبہ) انیس احمد خان صاحب فرمایا کرتے تھے ظفر معین بلے اور آمنہ معین بلے انکی (صدیقہ بیگم) کی ادبی اولاد ہیں۔
مدیر اعلیٰ :- بحیثیت مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ ''ادب لطیف'' لاہور مسلسل چالیس برس تک خدمات انجام دیں۔
مشاغل :- صدیقہ بیگم کی زندگی میں دو شوق خاص اہمیت کے حامل تھے۔
ایک اردو اور انگریزی ادب کی کتب کا مطالعہ ادبی کتب میں بھی شاعری کی نسبت فکشن پر زیادہ توجہ رہی۔ بے شک ان کی نظر میں مطالعہ کتب بھی سانس لینے سے کم اہم نہیں تھا۔
دوسرا، سیر وسیاحت :- سیر وسیاحت کے حوالے سے دیکھیں تو انہوں نے کم وبیش 30 یا 35 ممالک کے دورے کیے ہونگے جو کہ خالصتاً علمی و ادبی نوعیت کے تھے۔ اور صرف سیر وسیاحت کی غرض سے کم وبیش 15 ممالک شمار کیے جاسکتے ہیں۔
صدیقہ بیگم کا جنون :- صدیقہ بیگم کی زندگی میں بلا کی تحمل مزاج اور بردباری تھی اور

حد درجہ صبر و قناعت بھی لیکن ان کو ایک جنون بھی تھا اور اس جنون کا نام تھا ماہنامہ ادب لطیف۔ لاہور کہ جس کے بانی صدیقہ بیگم کے والد چوہدری برکت علی تھے اور صدیقہ بیگم خود جس کی کئی دہائیوں تک مدیر اعلیٰ بھی رہیں۔ صدیقہ بیگم کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا اور بلاشبہ دنیا بھر میں ان کے مداح وادبی دوست اور ادب لطیف کے قارئین موجود تھے کہ جن سے ان کے روابط تھے۔

محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی لکھنوی ہندوستانی کا آبائی وطن تو سیوہارہ ضلع بجنور ہے۔ ان کی ولادت انیس سو پچیس میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے والد بابو شفیع احمد وارثی ایک مال دار اور خوشحال زمیندار تھے۔ ابھی صدیقہ بیگم سیوہاروی لکھنوی ہندوستانی کمسن اور شیر خوار ہی تھیں کہ ان کے سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا۔ انہیں اپنے بھائی اخلاق احمد وارثی سے بے حد لگاؤ تھا۔ محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی، لکھنوی، ہندوستانی صاحبہ الہ آباد میں قیام کے دوران کچھ عرصہ اردو جریدے فسانہ، الہ آباد کی مجلس ادارت میں بھی شامل رہیں جبکہ آواز نسواں، نیا راگ کے نام سے رسالہ بھی جاری کیے جو زیادہ عرصے تک نہ جاری رہ سکے جبکہ نورس کے نام سے جو جریدہ جاری کیا اس کے محض دو شمارے ہی منظر عام پر آسکے۔ لہٰذا ان کی ادارت کا دورانیہ مختصر بھی ہے اور کسی طرح سے بھی یا کسی انفرادیت کے باعث قابل ذکر بھی نہیں البتہ تاریخی حقائق پر مبنی ضرور ہے، صدیقہ بیگم ہندوستانی کی شادی تقسیم ہند یا قیام پاکستان کے ایک ماہ بعد جناب اطہر پرویز سے ہوئی۔ ان کے شوہر نے اپنی زوجہ محترمہ کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ گویا کہ پہلے بھائی اور بعدازاں شوہر کی جانب سے رہنمائی کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری رہا۔ جناب اطہر پرویز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر تھے۔ دیگر نامور ادبی شخصیات کی طرح پروفیسر ڈاکٹر اسعد بدایونی اور ڈاکٹر فوق کریمی علیگ سے بھی محترمہ صدیقہ بیگم ہندوستانی اور جناب اطہر پرویز کے بہت اچھے مراسم رہے۔ انیس سو چوراسی مارچ کی دس تاریخ کو جناب اطہر پرویز کی وفات ہوگئی۔ محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی لکھنوی ہندوستانی کے لیے اپنے شوہر کی وفات کا صدمہ ناقابل برداشت تھا لہٰذا محترمہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج اور لاچار ہوگئی تھیں۔ زندگی کے آخری چند برس میں تو محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی لکھنوی ہندوستانی کی یادداشت بری طرح متاثر ہو چکی تھی۔ ستمبر، سن دو ہزار بارہ کی انتیس تاریخ کو علیگڑھ میں سکونت پذیر محترمہ صدیقہ بیگم لکھنوی ہندوستانی اس جہان فانی سے رخصت ہوگئیں۔

☆☆☆☆☆

## سُریندر پرکاش کے افسانہ ''اجنبی کہانی'' کا تعبیر و تجزیہ: مابعد نوآبادیاتی سیاق و تناظر میں

The very title of the story is intriguing and gripping; a ' Strange Story '! On the surface of it, every story is strange for the reader as it gradually unfolds itself before the discerning reader. In this particular instance, the title of the story ' A Strange Story ', bespeaks of the multilayered aspects that the story imbibes.

The story revolves around the female protagonist named intriguingly ' Ayesha ', a name generally associated with Muslims but here it is the name of a lady associated with Parsi or Zoroastrian background. Why did the writer choose to use a Muslim sounding name to depict a non-Muslim woman is the first strange aspect of the story? Did Surendra Prakash want to convey something other than a woman's story. There is definitely a story within a story. The one layer is of the appeal of the orient to the occidental mind. To Winston, Ayesha is not just a woman, she is more like an enigma whom his western mind is dazzled by, but cannot understand. That's why despite being attracted to her, he gets rid of her, only to regret it towards the end.

میں نے ''اجنبی کہانی'' کا عنوان پڑھا اور مسکرا دیا۔ یہ مسکراہٹ مصنوعی نوعیت کی حامل نہیں تھی بلکہ میرے دل کے کسی عمیق اور گہرے چشمے سے کسی خودرو پودے کی طرح پھوٹی اور میرے ہونٹ ایک پھول کی طرح کھل اُٹھے۔ میں نے سوچا کہ میں اِس سے آگے مزید نہیں بڑھ سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں اِس عنوان سے پُر لطف ہوئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ درحقیقت لفظ ''اجنبی'' نے مجھے روکا اور لفظ ''کہانی'' نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اِس عنوان کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ اور اِس کا ترجمہ انگریزی میں کیسے کیا جا سکتا ہے؟ میرے ذہن میں مختلف الفاظ چل رہے تھے اور میں نے اپنے ذہن کے کسی نہاں خانے میں موجود ذخیرۂ الفاظ میں سے کچھ الفاظ تلاش کیے، جو تھے ''اسٹرینج اسٹوری'' (Strange Story)۔ مزید آگے بڑھنے سے پیش تر میں نے سوچا کہ جب سُریندر پرکاش اپنی کہانی کے عنوان میں اِس طرح کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو اس کے عقب میں کچھ نہ کچھ نہایت پُرکشش اور دل پذیر ضرور ہوگا۔ (۱) اجنبی (۲) تخیلاتی (۳) جادوئی یا طِلسماتی اور کبھی کبھار یہ نہایت پُرتجسس اور سوچنے پر آمادہ کرنے والا ہوتا ہے یا اس کے بطون میں کارفرما مختلف مفاہیم مخفی بھی ہوسکتے ہیں۔ کبھی کبھار سے مفصل انداز میں پڑھنا اَدق بھی ہوسکتا ہے۔ یہ کسی مسئلے یا اُس کے حل کو پیش کرنے کے لیے علامتی بھی ہوسکتا ہے۔ یہ انسان کی انفرادی صلاحیتوں کے لیے مہمیز کا کام کرکے اُس کی رُوح کو بھی چُھو سکتا ہے۔ یہ زندگی کے مفاہیم کو سمجھا کر قاری کو دانش و حکمت کے اگلے درجے پر بھی لے جا سکتا ہے یا اُسے کسی غلط فہمی کا بھی شکار کرسکتا ہے۔ یہ اُسے حیران اور پریشان بھی کر سکتا ہے۔ یہ پُرتجسس بھی ہوسکتا ہے اور انفرادی و اجتماعی سطح پر زندگی کے حقائق کو واضح اور عیاں بھی کرسکتا ہے۔ یہ کسی قومی یا بین الاقوامی مقصد کے تحت بھی لکھا جا سکتا ہے ۔ یہ خوف ناک بھی ہوسکتا ہے اور قاری کو خوف زدہ بھی کرسکتا ہے، وہ اِس لیے کہ اس کہانی کا مصنف انسانی فطرت اور انسانی رویوں کی نہایت عمیق پرکھ اور فہم رکھتا ہے۔ یہ قاری کی صلاحیت کو مہمیز کرنے کے لیے کسی سماجی، سیاسی، مابعد نوآبادیاتی، نفسیاتی یا ذہنی و فکری مسئلے کو بھی ظاہر کرسکتا ہے۔ یہ کسی ماورائی یا تخیلاتی کہانی پر بھی مبنی ہوسکتا ہے جو ذہن کو بلا کے رکھ سکتی ہے، لیکن سُریندر پرکاش کے معاملے میں اِس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہو سکتا ہے کیوں کہ وہ آئیڈیولوجی، خیالات و تصورات اور حقائق نگاری اور علامت نگاری کے امتزاج سے بھرپور ایک فکشن رائٹر ہے اور اُسے ماضی، حال اور مستقبل پر بھی دسترس حاصل ہے، وہ ماضی کو حال میں منقلب کرکے دیکھا سکتا ہے اور حال کو استقبال میں لے

جا کر دیکھ اور دیکھا سکتا ہے، وہ دُھند کے پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سُریندر پرکاش ایک معروف افسانہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر تھے، اُن کا موضوعاتی مقصد کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔ یہ افسانہ ہمیں ہنسا بھی سکتا ہے اور افسردہ بھی کر سکتا ہے اور مذکورہ افسانہ قاری کے نظریات اور افکار میں تبدیلی بھی لاسکتا ہے۔ اِس افسانے کے اُسلوب میں نیا پن اور روایت سے انحراف کا معاملہ بھی ہوسکتا ہے۔ اِس افسانے کی کہانی آپ کی، میری یا کسی کی بھی ہوسکتی ہے۔ اِس افسانے کی کہانی متعدد پرتوں کی حامل تو ہے ہی مگر اس میں مغرب کا ڈسکورس بھی حیران کُن ہے جو نہ صرف طاقت سے بُجھا ہوا ہے اور مشرق کا ڈسکورس بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ طاقت کیسے اندھی ہوتی ہے اور قدروں اور رشتوں سے بے نیاز اور لاتعلق مگر وہ رشتے کون سے؟ جن سے بے گانگی اور Alienation کا اُسلوب اور انداز روا رکھا جاتا ہے۔ اِس افسانے میں تو مغرب کا ڈسکورس یہی باور کراتا ہے کہ مشرق سے لاتعلقی اور نظر انداز کرنے کا جو معاملہ ہے، وہ نہایت عجیب و غریب صورتِ حال کی غمازی پر مبنی ہے۔

یہ افسانہ شعور و آگہی کے ذریعے اور بے مثال مکالمات کے وسیلے سے، حالات کو غیر متوقع طور پر عیاں کرنے والا ہے جو ذہن و فکر کو محض لُطف اندوز ہی نہیں کرنے والا بلکہ ذہنی و فکری عمل کو بھی اثر انداز کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ اب یہاں وِسٹن اور افسانے کی پروٹیگنسٹ عائشہ جو ایک پارسی بیک گراؤنڈ کی نوجوان خوب صورت لڑکی ہے، اُس کے اور وِسٹن کے درمیان مکالمت کے فطری بہاؤ کو ملاحظہ کیا سکتا ہے، جب وِسٹن مشرقِ وسطیٰ میں کسی مقام پر تیل کی پائپ لائن کا کام مکمل کر چکا ہے اور عائشہ کے ساتھ دھوکا دھڑی کر کے اور اُسے چکما دے کر بندرگاہ کی راہ کے بجائے ہوائی جہاز کا ٹکٹ لے کر لندن پہنچ جاتا ہے۔ وِسٹن مغربی ڈسکورس کا نمائندہ کردار ہے اور وہ مشرق کو کیسے Betray کرتا ہے اور اپنے وعدے کو کیسے توڑ ڈالتا ہے، حالات و واقعات کے تانے بانے سے تمام صورتِ حال مترشح ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب وِسٹن کے لندن جانے سے پہلے کے مکالموں میں مصنف کے کمالِ فن پر ایک عمیق نظر ڈالی جاسکتی ہے اور وِسٹن کے کردار کی تمام تر صورتِ حال اور نفسیات کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

"عائشہ نے اپنی سیاہ گہری آنکھوں سے اُس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ "یہ ناممکن ہے۔" اُس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا "میں بھی تمھارے ساتھ آؤں گی۔"

"تم میرے ساتھ نہیں آسکتیں۔" جان وِسٹن نے کم زور احتجاج کیا۔

"مجھے آنا ہی چاہیے۔ تم انگریز ہو۔"

"یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے۔"

''مجھے آنا ہی ہوگا۔'' عائشہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ تمھیں معلوم ہے ہمارے لوگ انگریزوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تم چوروں کی طرح اُن کی زمین اور اُن کے پیسے پر قبضہ کر رہے ہو۔ میں نے تم سے محبت کر کے بہت گناہ کیا ہے، جب تک تم میرے ساتھ ہو۔ وہ مجھے ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں کر سکتے، لیکن جیسے ہی تم جاؤ گے۔ مجھے اپنے گناہ کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ سچ مچ مار ڈالیں گے۔''

''وہ اس کی ہمت نہیں کر سکتے!'' وِسٹن نے اُونچی آواز میں کہا، لیکن وہ بہ خوبی جانتا تھا کہ یہ خطرناک لوگ سب کچھ کر سکتے ہیں۔

''اُنھوں نے مجھے دھمکی دی ہے۔ مجھے تمھارے ساتھ آنا ہی پڑے گا۔ میں ہمیشہ تمھارے ساتھ رہوں گی۔ اُس وقت بھی جب تم یہ ملک چھوڑ کر اپنے وطن واپس جاؤ گے۔ وعدہ کرو کہ تم مجھے اپنے وطن لے جاؤ گے۔''

وِسٹن نے اثبات میں سر ہلایا اور کم زور آواز میں کہا: ''ہاں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔''(۱)

افسانے کی پروٹیگنسٹ پارسی بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی ہے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فکشن رائٹر نے کہانی کی پروٹیگنسٹ کا نام عائشہ ہی کیوں منتخب کیا ہے؟ اُس کے انتقام لینے کا عمل تو اُس کی اورینٹل فکر کو ظاہر کرتا ہے۔ اورینٹل ٹچ Oriental Touch افسانے میں اس لیے بھی ہے کہ اس کی پروٹیگنسٹ (Protagonist) ایک اورینٹل یعنی مشرقی خاتون ہے۔ اُس میں قبائلی عنصر بھی موجود ہے جو اُس کی نفسیات میں رچا بسا ہوا ہے اور کسی بھی طریقے سے وہ اپنے اندر سے اُس قبائلی عنصر کو ختم نہیں کر سکتی۔ وہ جو انتقام اور بدلہ لینے کا جو ایک تصور ہے، وہ عود کر آتا ہے، اگرچہ بعد میں وہ اُس سے سیکھتی بھی ہے۔ اس کہانی کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ایک پرت تو اوکسیڈینٹل اور اورینٹل کی صورت میں ہے کہ آپ اوکسیڈینٹل آئی یعنی مغربی آنکھ سے پورے مشرق کو دیکھ رہے ہیں، یہاں وِسٹن اورینٹل حالات و واقعات اور سماج کو مغربی زاویہ نظر سے دیکھتا ہے اور نئی گزرگاہوں اور ترقی کے نئے منطقوں کو وہ یعنی اہلِ مغرب، مغربی سیاق و تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ایک مقام پر وِسٹن نے جس انداز سے کہانی کی پروٹیگنسٹ کے ساتھ دھوکا دھڑی کی ہے اور مصنف نے اُس تضاد کو جس طریقے اور ہنرمندی کے ساتھ نمایاں کیا ہے جو مشرق اور مغرب کے درمیان رنگ و نسل (White and NonWhite) اور احساسِ تفاخر اور مغربی برتری کے حوالے سے ہے، مذکورہ صورتِ حال ولخراش ہونے کے ساتھ ساتھ مشرقی انسانوں کو ایک کموڈٹی (Commodity) کی سطح پر ظاہر کرتی ہے، لیکن یہ آئیڈیالوجی مغربی فکر و فلسفے کی پیدا کردہ ہے، اب جب وِسٹن واپس

انگلینڈ جانے کا فیصلہ کر لیتا ہے اور عائشہ اپنے جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر رونا شروع کر دیتی ہے تو وسٹن اُسے جھوٹی تسلی دیتا ہے مگر اصل صورتِ حال سے عائشہ کو آگاہ کیے بغیر تپلی گلی سے نکل جاتا ہے یا دُم دبا کر بھاگ جاتا ہے یعنی بحری راستے کے بجائے، وہ ہوائی جہاز کے ذریعے انگلینڈ کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ اِس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

''رومت--- رومت---'' اُس نے شکست خوردہ لہجہ میں کہا: ''تم میرے ساتھ چلو گی--- ضرور۔''

اِس طرح جان وسٹن نے مسئلہ کچھ دیر کے لیے حل کر لیا اور عائشہ اُس کے ساتھ بندرگاہ چلی آئی، لیکن اب وہ تمام رات جاگا کرتا۔ عائشہ کو انگلینڈ لے جانا اُس کے لیے ناممکن تھا اور اُسے یہیں ٹھہرنے پر راضی کرنا بھی ناممکن تھا۔ کئی دن کی سوچ کے بعد آخر کار اُس نے فیصلہ کیا۔ اُس نے عائشہ کو بتایا کہ دو دن بعد وہ ایک جہاز سے روانہ ہو رہے ہیں اور جب وہ جہاز سے روانگی کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اُس نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدا اور چپکے سے انگلینڈ روانہ ہوا۔ (۲)

اب یہاں ایک جانب اورینٹل سوچ (Oriental Thought) ہے اور دوسری جانب اوکسیڈینٹل سوچ ہے، جس کی یہ علاقے پوری طرح تحسین نہیں کر سکتے۔ یہ چیزیں شاید ان کے مفاد میں نہیں ہیں یا شاید یہ عناصر ویسٹ (مغرب) کے مفاد میں ہی ہیں۔ ماضی بعید میں اہلِ مشرق کا یہ ایک زاویۂ نظر بہرحال رہا ہے۔ اِس افسانے کو انڈیا کے 'پرسپیکٹیو' (Indian Perspective) سیاق میں نہیں دیکھنا چاہیے، اِس افسانے کو مشرقِ وسطیٰ اور ایران (Middle East and Iran) کے 'پرسپیکٹیو' (Perspective) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایران کے ترقیاتی کام اپنی جگہ ٹھیک تھے، لیکن ایران کے دیہی علاقوں کے لوگوں تک اُن ترقیاتی کاموں کے ثمرات پہنچے بھی نہیں اور نہ ہی دیہی علاقوں کے لوگوں نے اُن ترقیاتی کاموں کو پوری طرح لائقِ تحسین تصور ہی کیا تھا، اور پھر یہ کہ یہ فکر رکھنا کہ یہ ترقیاتی کام ہمارے لیے ہی ہیں اور اِس سے ہمیں فائدہ ہوگا۔ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے یا اپنے دُنیا سے الگ تھلگ اور ''کٹ آف'' (Cut Off) ہونے کی وجہ سے یا کسی بھی وجہ سے یا ایک ریاست اور عوام کے درمیان جو کٹاؤ اور بُعد یا خلیج یا ایک فاصلہ ہے، ایک بات یہ بھی ہے کہ ریاست جو بھی کام کرے، اُسے نیگیٹیو (منفی) ہی لینا ہے، جیسے ہم لوگ ریاست کے ہر کام کو نیگیٹیو (منفی) (Negative) ہی لیتے ہیں۔ ریاست اور عوام کے درمیان کئی ایک حوالوں سے تناؤ کی کیفیت ہے۔ اِس افسانے کو ہم دو حصوں میں منقسم کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ ایک مقامی

اور مخصوص حالات و واقعات کے تناظر میں دیکھ سکتے ہیں کہ جہاں پر ایک برتر اور بدیسی مغربی قوت ہے اور ظاہر ہے کہ وہ لوگوں کو کیسے اس جانب لا سکتی ہے۔ اُن کا آپس میں ربط و تعامل بھی نہیں ہے اور ایک مقام پر اگر ربط و تعامل کی صورت پیدا بھی ہوتی ہے تو وہ چھوٹے کینوس پر ایک پکچر (Picture) بناتی ہے اور مذکورہ پکچر (Picture) بھی مشرق کی اجتماعی نفسیات کی عکاسی پر مبنی ہرگز نہیں ہے بلکہ ایک انفرادی تعلق ہے جو جذباتی نوعیت کا حامل ہے، عائشہ کے حوالے سے تو کم از کم یہی کہا جا سکتا ہے:

''اُس کے ذہن میں یہ لڑائی چل رہی تھی، لیکن عائشہ کو اس کی فکر نہیں تھی۔ وہ دن بھر اُس کے اردگرد منڈلایا کرتی تھی، کبھی کبھی تو وہ اُس کے اِتنے قریب آ جاتی کہ اُس کے جسم کی گرمی جان آسانی سے محسوس کر سکتا۔ اِنھی دنوں جان نے عائشہ کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ سچ مچ خوب صورت تھی۔ بے حد خوب صورت۔ اُس کا رنگ سانولا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور چمک دار تھیں اور جسم کے قوس بے حد دل کش تھے۔ وہ معمولی مزدور لڑکی کہاں تھی۔ وہ تو ایرانی ملکہ تھی۔ وِسٹن یہ غور کئی دن اُسے دیکھتا رہا اور آخر میں اُس نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ ایک شام عائشہ جب اُس کے خیمے میں کام کرنے آئی تو اس نے عائشہ کو بلا کر قریب کھینچ لیا اور پھر سب کچھ ہو گیا، لیکن وِسٹن کو اب کسی بات کی فکر نہیں تھی۔ وہ خوش تھا اور عائشہ بھی بہ ظاہر خوش تھی پھر فکر کس بات کی؟'' (۳)

اور افسانے کا دوسرا حصہ وہ ہے، جہاں انگلینڈ میں افسانے کی پروٹیگنسٹ (Protagonist) یعنی کرسٹن کی بیوی اور اُس کے بچوں سے ملتی ہے اور وہاں کی مغربی فضا، ماحول اور حالات و واقعات ہیں، ایک دوسری صورت حال ہے۔ جہاں وِسٹن کی اپنی زندگی اپنی مغربی بیوی مارتھا کے ساتھ چل رہی ہے، جہاں دوسری عالمی جنگ ہے اور برٹش ایمپائر (سلطنت) مشکلات سے دوچار ہے اور جہاں جرمنی کے ساتھ انگلینڈ دوسری عالمی جنگ میں کم و بیش مضمحل ہونے کے قریب قریب ہے، لیکن وِسٹن اپنے ملک اور اپنی قوم اور نوآبادیاتی فکر (Colonial thought) کے ساتھ نہ صرف پوری طرح کھڑا ہے بلکہ متحرک اور فعال کردار کا بھی حامل ہے اور اپنی نسلی اور ثقافتی برتری کا بھی غمازی نظر آتا ہے اور اگر وہ کسی کو اپنی سوچ سے محو کر چکا ہے تو وہ مشرقی زمین سے تعلق رکھنے والا ایک کردار عائشہ ہی ہے، یہاں عائشہ پورے مشرق کی سرزمین کی علامت کے طور پر اُبھرنے والا ایک کردار ہے جو پورے کے پورے مشرق کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اب انگلینڈ میں وِسٹن نہ صرف مارتھا سے شادی کر کے اپنی شادی شدہ زندگی آغاز کر چکا تھا بلکہ اُس نے اپنے بچوں اور فیملی

کے ساتھ ڈارکنگ میں مستقل قیام پذیر ہونے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ اپنے مخصوص کام ، پالیسی اور نوآبادیاتی سوچ دونوں کے ساتھ کمٹڈ (Committed) نظر آتا ہے:

وقت دَبے قدموں گزرتا رہا۔ جان وسٹن کی عمر اب چالیس سال کی ہوگئی تھی۔ دُور دُور کے ملکوں میں جا کر اُس نے بہت کام کیا تھا۔ اب اُسے اِس کام میں کوئی خاص دل چسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اِس کے علاوہ جن بڑی بڑی فرموں سے اُس کا تعلق تھا۔ اُنھوں نے اپنا کاروبار بدل دیا تھا۔ جان وسٹن نے سوچا کہ اب اُسے اپنی زندگی کا رخ بدل دینا چاہیے۔ طالب علمی کے زمانے سے اُس کے دل میں ایک خواہش پنہاں تھی، کہ کسی اچھی سی فرم میں حصہ دار بن جائے اور زندگی کے باقی دن آرام سے گزار دے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ جان کی قابلیت سے لندن کے کاروباری حلقے اچھی طرح واقف تھے۔ کئی فرموں نے اُسے حصہ دار کا آفر دیا، جن میں سے ایک آفر کو اُس نے قبول کر لیا اور ساتھ ہی اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا کیوں کہ اب اس کا مستقبل محفوظ تھا۔

اِس واقعہ کے کچھ دن بعد اس نے اپنے پارٹنر کی بڑی لڑکی 'مارتھا' سے شادی کر لی۔ 'مارتھا' ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ وہ نہ تو بہت جوان تھی، نہ بوڑھی، شادی کے وقت اس کی عمر تیس سال تھی۔ اُس کی عادتیں جان وسٹن سے ملتی جلتی تھیں۔ جان کی طرح اُس نے بھی اپنی زندگی بڑی خاموشی سے گزاری تھی۔ بہر حال شادی ہوئی اور دونوں نے سر جوڑ کر فیصلہ کیا کہ شہر ڈارکنگ مستقل سکونت کے لیے بہتر رہے گا۔ شادی کے کوئی ایک سال بعد پہلا بچہ پیدا ہوا۔ جان کو بڑی مایوسی ہوئی جب اُسے پتا چلا کہ اُس کے لڑکی ہوئی ہے، لیکن دو سال بعد قسمت جب پھر اُس پر مہربان ہوئی تو وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ اب کی بار اُسے لڑکا ہوا تھا۔ لڑکے کی پیدائش کے وقت سے ہی اُس نے منصوبے بنانا شروع کیے کہ وہ کون سے سکول جائے گا اور کیا بنے گا۔ (۴)

افسانے میں ایک نئی جہت اُس وقت سامنے آتی ہے، جب عائشہ دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں انگلینڈ پہنچ جاتی ہے، وہ نہ صرف انگلینڈ پہنچ جاتی ہے بلکہ وہاں ریڈ کراس میں خدمات بھی انجام دینا شروع کر دیتی ہے۔

[جاری ہے۔]

نبیل احمد نبیل

# ادب کے معمار ___ خالد احمد

حالی نے کہا تھا جب ایک شخص کسی قابل آدمی کی تعریف کرتا ہے تو دونوں زندہ جاوید ہو جاتے ہیں ایک اپنی قابلیت کے سبب اور دوسرا اُس قابلیت کی پہچان کے باعث۔ سو یہ فرمان نعمان منظور پر صادق آتا ہے کہ خالد احمد جیسی نابغہ شخصیت کی قابلیت، لیاقت، علمیت، منزلت اور حیثیت کو پہچانا اور اعتراف عظمت کے طور پر پورا ایک علمی مقالہ لکھ دیا۔ لکھا ہی نہیں اکادمی ادبیات کے تحت کتاب کی صورت میں چھپوا بھی دیا، سچ کہتا ہوں اس نوع کی تحقیق و تدوین پر کم از کم ایم فل کی ڈگری مل جاتی ہے۔

سو یہ علمی کام بجائے خود اس مقام کا حامل ہے۔ اس نے خالد احمد کی قابلیت اور نعمان منظور کی نظرِ ادراک کے باعث دونوں کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔

اردو زبان و ادب کے ایک بہت بڑے نامی، شاعر، ادیب، ڈراما نگار، کالم نویس اور سکالر خالد احمد سے بے تکلفانہ تعلق، بیسیوں مشاعروں میں میری میزبانی اور خالد احمد کی صدارت، ریڈیو پاکستان کے ادبی پروگرام کے لیے ان سے کیا انٹرویو اور پاکستان ٹیلی وژن میں پروڈیوسر سر ناصر خان کی ہمراہی میں ہماری ادبی محفلیں۔

نعمان منظور! آپ نے کما حقہ، اُسی خالد احمد سے دوبا ہ ملا دیا ہے۔ گاہ قہقہے لگاتا، لطیفے سناتا، جملے کستا خالد احمد۔ گاہ دقیق نکتوں کے کشف میں مصروف نہایت عالمانہ سنجیدگی سے مخاطب خالد احمد۔ ہاں ہاں نعمان منظور نے اسی خالد احمد سے

**عرفان جمیل**

ملاقات کرائی ہے مگر فریقین کا تعارف کرا کے ایک طرف کو نہیں ہو لیے، بیچ میں، درمیان میں، مابین کھڑے ہو کر عارف کو معروف سے غافل نہیں ہونے دیا۔ نعمان منظور نے خالد احمد کے خانوادہ، سوانح، شخصیت، تخلیقات، خالد احمد کی نعت نگاری، شاعری، نظم، ڈراما، مضمون، کالم اور اپنے تعلق کی نسبت جزئیات سے مدلل، محققانہ اور دانش ورانہ تجزیہ محض ایک تعلق دار کا تجزیہ نہیں ہے بلکہ سچے طالب علم کی کھوج پرکھ ہے جس میں مشاہیر کی آرا سے دلیل و دعویٰ کو محکم کیا ہے ۔ نعمان منظور نے تنقیدی شعور کا منصفانہ استعمال کرتے ہوئے خالد احمد پر ایک ایسی کتاب تصنیف کی ہے جو آئندہ کا ایسا مواد عطا کر رہی ہے جس سے استفادہ کر کے طالب علم، صحافی، تجزیہ کار، مورخ، محقق، ادیب بھی تصنیف و تالیف کر سکیں گے۔ نعمان منظور جو خود ناقد، محقق، شاعر، ادیب اور صحافی ہیں ایک علمی روایت کے وارث ہیں۔ اک عملی شخصیت کی حیثیت سے خالد احمد جیسی ممتاز، معروف اور محبوب ہستی کو زبانی بیانوں سے تحقیقی، علمی اور تصنیفی راستوں سے گزار کر منارۂ بلند پر ایستادہ کر دیا ہے، جہاں وہ ہر طرف سے ہر ایک کو صاف دکھائی دے رہے ہیں اور ہر ایک اپنی ضرورت اور استطاعت کے مطابق نظارہ کر رہا ہے۔ نعمان کا اندازِ تحریر سلیس، دل کش، دل چسپ اور شگفتہ ہے۔ انھوں نے بقول حالی ایک بڑے آدمی کی قابلیت کا اعتراف کر کے دوسروں کو اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ قابلیت، صلاحیت، ادبیت، شعر و سخن، نعت نگاری، ڈراما کالم، مضمون اور تمام اصناف کی تعریف، تحریر، معیار اور قواعد سے وہ خود کس قدر آشنا ہیں اور اپنی قابلیت کی مقدار کس قدر بلند ہے۔

دو سو پچاس صفحات پر مشتمل اس کتاب کو اکادمی ادبیات پاکستان نے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ پاکستانی ادب کے معمار کا علمی سلسلہ متقاضی تھا کہ خالد احمد جیسا اہم ترین ادب معماروں کی صف میں کھڑا ہو کہ اس کا شمار عظیم لوگوں کی قطار میں ضروری تھا۔ نعمان منظور نے خالد حمد کی گراں قدر تصانیف سے نثری اقتباسات اور شعری حوالوں کا جو انتخاب کیا ہے وہ ناقدانہ شعور، بلند ادبی ذوق، نظرِ عمیق اور نگاہ دقیق کا ثبوت ہے۔ کتنے دن، کیسے شب و روز ایسی علمی کاوشوں کی نذر ہوتے ہیں تو شاہکار تخلیق بنتے ہیں۔ نعمان منظور نے تخلیق کو شاہکار بنا دیا ہے۔

☆☆☆☆☆

# مظفر بخاری: ایک حساس اور منفرد فنکار کی ادبی مسیحائی......!

شہزاد تصور

کسی بھی کہنہ مشق وثقہ ادیب بالخصوص نثر نگار کے لیے کچھ بھی لکھنا اتنا ہی آسان جتنا ایک تمباکو نوش کے لیے محض سگریٹ کا گل جھاڑنا......! بس قلم تھاما اور چند لمحوں کے لیے نظریں کاغذ پر ہی تو ٹکائے رکھنا ہے...... یہ الگ بات کہ ان لحات کا دورانیہ محض اس وقت کے لیے محدود جب تک کہ پیشانی پر خون کے چند قطرے ٹپکنے کے لیے بالکل بے قرار نہ ہو جائیں۔ لیکن یہ خونچکاں تخلیقی کیفیت معدودے چند اہل قلم ہی کے مزاج کا خاصا اور اس سے گزرنا بھی کم کم ہی نصیب...... کیونکہ یہی وہ لمحے ہیں جب کوئی فطری شاہکار...... زمانوں کو چونکانے، فکر ونظر کو یکسر بدل کر رکھ دینے، حیات کی تہہ در تہہ پیچیدہ گتھیوں کو بساط بھر سلجھانے...... یا پھر...... مختلف النوع تاریکیاں مٹانے ، ان گنت سربستہ رازوں سے پردے ہٹانے اور نجانے کب سے بھٹکتی انسانیت کو نئے راستوں، نئی منازل کے تعین میں رہنمائی کے لیے کوئی نہ کوئی ایسا چراغ جلائے رکھنے کے لیے یوں سامنے آتا ہے کہ کبھی بھلائے نہ بھلایا جا سکے۔ جناب مظفر بخاری بھی اپنی نوع کے منفرد ادیب اس لحاظ سے کہ کنارے پر کھڑے رہ کر کسی کے ڈوبنے کا تماشہ دیکھنے تک محدود کبھی نہ رہ پائے اور تیراک نہ ہونے کے باوجود درد آشنائی کی شدت تو دیکھیے...... لگائی جانے والی چھلانگ تو دنگ رہ ہی گئی...... خود گہرائی تک دم بخود سی کہ ایسے جانباز اور کسی بھی قسم کے خوف وخطر سے بے نیاز درویش کے لیے تو کسی بھی حد تک چلے آنا بعید از قیاس نہیں...... یوں بھی تعداد میں مٹھی بھر ہی تو ہوں گے ایسے دیوانے...... چلو اک مظفر بخاری بھی شامل سہی......!

حیات کی ازلی پیچیدگیوں، نت نئی تلخیوں، وقت اور حالات کی سفاک کرتوتوں، نوکیلی وچبھن آمیز الجھنوں سے مسلسل نبرد آزمائیوں اور فطری مدافعتوں کا حاصل غیر معمولی شعوری پختگی، قدرتی بے نیازیوں سے خوب آشنائی اور نہ صرف اپنی دنیا بدلنے بلکہ حسب آرزو نئی سے نئی دنیائیں تخلیق کرنے کے لامحدود اختیارات سے نوازے جانے کے نکتۂ عروج ہی کا دوسرا نام اشرف المخلوقات ہے۔ یہ الگ بات کہ ارتقائی سفر کے کبھی نہ رک پانے کے باوجود جہالت بھی ہمیشہ سائے کی طرح تعاقب میں رہی۔ لیکن

مظفر بخاری نے تاریک سے تاریک تر معاملات زیست میں بھی روشن پہلو ڈھونڈ نکالنے کا بھید اپنی مثبت فکر کے تحت پا لیا تھا اسی لئے ہماری معاشرتی زندگی میں کونسا ایسا چھوٹے سے چھوٹا بکٹیریا ہوگا جو مظفر بخاری کی آنکھ کی خوردبین سے بچ پایا ہو۔ فطری تجسس کا ماحصل عقل و دانش کے بلند مرحلوں کا کبھی نہ رکنے والا دردناک سفر..... جبکہ ہر لمحہ پل صراط..... لیکن اعلیٰ اذہان کے لے حسن کائنات..... اسی لئے دریا صفت مظفر بخاری نے کسی الجھن کا شکار ہوئے بغیر خندہ پیشانی سے حقائق کا سامنا کرتے ہوئے نتائج اخذ کئے اور جز سے کل تک مجسم اقرار رہتے ہوئے اپنی منزل اور راستوں کا تعین خود کیا اور اپنی غیر معمولی ذہانت، فہم و فراست اور قابل رشک حد تک عمیق مشاہدے کی پرکار فنکارانہ طور انتہائی خوش اسلوبی سے استعمال کرتے ہوئے ادب اور ادیبوں میں اپنی انفرادیت اور معتدل شخصیت کو منوایا۔

مقصد حیات بنظر غائر انفرادی اغراض و مقاصد کی تکمیل اور وقت کی لمحہ لمحہ بدلتی کروٹوں کے تحت بمطابق ذہنی رسائی متعین نکتۂ نظر کی پرکار کے گرد گھوم رہا ہے تاہم گردش ایام کے دوران جب ناآسودگی اور مختلف النوع محرومیاں مسلسل منہ چڑاتی دکھائی دیں تو کم فہمی کا حاصل محض لاحاصلیت..... لیکن مظفر بخاری کی فکری گہرائی اور گیرائی نے نہ صرف ان کے فن کو جلا بخشی بلکہ دل میں موجود فنکارانہ روشنی نے پسپائی اختیار کرنے یا فرار کے بجائے عمر بھر پامردی سے مقابلے اور انسانیت کا علم بلند کئے رکھنے کے حوالے سے بھی پایۂ استقلال میں لغزش نہ آنے دی یہی وجہ ہے کہ تاحیات انہوں نے قدرت کے فسانے میں نہ صرف اپنا کردار بہ احسن نبھایا ..... بلکہ سود و زیاں سے بے نیاز..... بحیثیت فنکار تمام تر محاسن کا استعمال اس عمدگی سے کیا کہ آئندہ نسلوں کے لیے مثبت راستہ ہموار کئے رکھنے کا ایک بلند اور قابل رشک استعارہ بن گئے۔ بحیثیت ادیب و کالم نگار ان کی ہر تحریر عمدہ نثر کا ایک نمونہ ہے۔ تادم تحریر جب اہل قلم کی اکثریت اپنی پیشانی پر "برائے فروخت" کا ایک ان دیکھا لیبل لئے پھرتی ہے، مظفر بخاری کا اس قسم کی خرافات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ان کے ہاں کہیں جانبداری یا کسی قسم کی ذاتی وابستگی کا معمولی سا بھی شائبہ موجود نہیں۔ آج جب کوئی نظریاتی نہیں رہا بلکہ تقریباً سبھی مفاداتی ہو کر رہ گئے ہیں..... اور اس عہد میں بھی جسے اگر کائنات کا دور شام کہا جائے تو قطعاً غلط نہ ہو گا..... آخری دم تک اپنے نظریات کو ہر شے پر مقدم رکھا۔ وہ محض ادیب یا کالم نگار نہیں بلکہ بجائے خود ایک نظریہ..... ایک تحریک ..... جو معاشرتی ناہمواری اور عدم انصاف کا ردعمل ہے۔ روشن خیالی اور اعلیٰ انسانی اقدار کی پاسداری ان کے نزدیک ایک مقدس فریضہ ہے۔ اپنے اردگرد ہر طرف اجارہ داریوں..... مروج فرسودہ اور کہنہ رسوم ..... اور طاقتوروں کی چیرہ دستیوں کے خلاف قلم آزمائی ان کی فطرت ثانی تھی۔ محض ترقی پسند قرار دینا بھی شاید انہیں اسی کتب فکر تک محدود کئے رکھنے کے مترادف ہوگا کہ ان کی ذہنی رسائی اور بصیرت و

بصارت یقیناً اس سے کہیں زیادہ ......
اور...... تجربات کی بھٹی میں کندن ہونے کا ہی نتیجہ تھا کہ تخیل کی پرواز انہیں یہاں تک لے آئی :

اور ہی کچھ زندگی ہوتی زمانے کے لیے
میں اگر کردار چنتا اس فسانے کے لیے

..................

فی زمانہ اہلِ فکر کی بلند نظری اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالامال ہونے جیسے اعزاز کا ادراک قدرے پست اذہان کے لیے محض دو الفاظ ''کربِ آگہی'' تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور یہی رونا روتے رہنا ایک روایت ٹھہری۔ عمروں کی عمریں اسی رہٹ کے گرد بیلوں کی طرح چکر لگاتے گزار دی جاتی ہیں جبکہ پختہ طبعوں کے بلند فکری اور وسعت نظر با الفاظ دیگر مثبت الذہنی جیسی نعمت الٰہی سے پیدائشی طور نوازے جاتا ہے...... یہ الگ بات کہ نجانے کتنے طے شدہ حقائق بھلے ایک طرف ......لیکن بے شمار احباب کے لیے اختلافی پہلو ڈھونڈ نکالنا...... بھی ممکن ہے۔ لیکن اس سے مفر نہیں کہ مظفر بخاری نہ صرف بالائی سطور میں بیان کردہ تمام خوبیوں سے مالامال...... بلکہ نہیں...... اگر یوں کہا جائے تو بجا طور اس حقیقت سے بھلا کسے انکار ہوگا کہ ان کی شخصیت میں ایک بڑے فنکار کی وہ تمام تر خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں جن کے لیے کسی بھی قسم کی کوئی تاویل لازم نہیں کہ ان کی ہر ہر تحریر اور تصنیف اپنے آپ میں ان تمام فنی جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے جسے اگر اردو ادب کا بلند پایہ نثری سرمایہ قرار دیا جائے تو دیانتداری کے تمام تقاضوں کے عین مطابق اور قرین انصاف ہوگا۔

اب ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو کی طرف آتے ہوئے کسی قسم کی تمہید کی ضرورت نہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے مظفر بخاری کے حوالے سے قدرت شاید انتہائی خوشگوار موڈ میں تھی کہ خاصی فیاض و مہرباں ثابت ہوئی...... یہی وجہ ہے کہ بجائے خود فطرت تک کے دل میں جھانک لینے کی خداداد صلاحیت، حیران کن تخلیقی وفور اور موت و حیات کے درمیان جاری ازلی آنکھ مچولی انہیں مثبت مزاج تک کشاں کشاں لئے چلی آئی۔ کہتے ہیں کہ انسان کو ناخوش دیکھ کر زندگی کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے...... خوش دیکھ کر مسکراتی...... لیکن جب آپ کسی دوسرے کو مسرت دیتے ہیں تب زندگی بے اختیار خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ اس لحاظ سے مظفر بخاری کلی طور سراپا تحسین ٹھہرے کہ مسرتیں تقسیم کیے رکھنا اور انسانیت کے رستے ہوئے زخموں پر مرہم رکھنا ہی ان کے ہاں مفہوم حیات...... انتہائی واضح دکھائی دیتا ہے۔

آزردگیوں، افسردگیوں، رنجیدگیوں، محرومیوں اور ماتم کناں بے بسی و لاچارگی کے اندھے کنوئیں میں سے شگفتگی ڈھونڈ نکالنا...... سمندر کی آخری تہہ سے بھی کہیں بہت نچلی سطح تلے دبے وہ سیپ جو نجانے کب سے قطرۂ نیساں کے طلبگار ہوں لیکن مراد بر نہ آئی ہو...... بالکل اسی طرح مضطرب، سسکتی، کلبلاتی، نجانے کتنی اذیتوں سے دوچار...... اور دلوں میں صدیوں کی تاریکیاں لئے پھرتی انسانیت کی کایا اپنی فنی ہنروری سے جگمگاہٹوں میں پلٹ دینا...... کسی معمولی فنکار کے بس کا روگ نہیں...... لیکن...... یہ کام مظفر بخاری نے یوں کیا ہے جیسے

محض یونہی سینہ ٹٹولتے ہوئے ہاتھ کہیں دل پر جا پڑا اور اسے نکال کر کاغذ پر رکھ دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تصانیف بالخصوص طنز و مزاح پر مشتمل مجموعہ ''گستاخی معاف'' میں موجود ہر مضمون اور کردار ..... دوران مطالعہ ذہنی سکرین پر یوں متحرک دکھائی دیتا ہے جیسے قاری خود بھی انہی کے درمیان کہیں اسی فضا میں موجود ہو اور غیر محسوس طور پر آس پاس موجود ہر شے سے بالکل کٹ کر رہ گیا ہو۔ کسی بھی ادیب کے لیے قاری کی اس حد تک مکمل توجہ حاصل کر لینا..... ہرگز آسان نہیں! لیکن اعجازِ فن تو دیکھیے کہ مظفر بخاری کے ہاں یہ بالکل فطری سا معاملہ دکھائی دیتا ہے۔

خوشی اور مسرت اس تتلی کی طرح ہیں جو اپنی ایک جھلک دکھا کر اگلے ہی لمحے آنکھ سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ قمار باز کو چونکہ جوئے میں ایک مرتبہ جیت ضرور حاصل ہوتی ہے اسی لئے وہ اس ایک جیت کی امید پر ساری عمر ہارتا ..... لیکن ہمیشہ گنوانے کے باوجود نہ امید کی سانس ٹوٹتی اور نہ کبھی اس لت سے نجات حاصل کر پاتا ہے۔ انسان بھی بالکل اسی طرح خوشیوں کے تعاقب میں رہنے کے باعث ہمیشہ جو حاصل و میسر ہوا سے بھی جہنم نما بنائے رکھتا ہے۔ اس کے برعکس مظفر بخاری نے بحیثیت معاشرتی نباض انسانی کمزوریوں سے خوب آشنائی اور اپنے تجربات اور مشاہدے کی کسوٹی پر زندگی کو بہت کم عرصہ میں بہت اچھی طرح پرکھ لینے کے بعد تاریکیوں کے بطن سے پھوٹنے والے اجالوں کی حقیقت تک اپنی غیر معمولی ذہانت کے باعث رسائی حاصل کر لی تو ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جو ابند ھن فراہم ہوا اس نے ان کی فنی ہنروری میں نہ صرف غیر معمولی اضافہ بلکہ ہم عصر ادیبوں میں منفرد و ممتاز اور انتہائی نمایاں کر دیا۔ ساتھ ہی طنز و مزاح کے فن میں طاق اور یوں تلخیوں، مختلف النوع تکالیف و آلام سے دوچار ..... ہر لحاظ سے کچھ اتنی بیمار کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنا شکار، بوجھ نما اور اشکوں میں سرتاپا غرقاں چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنے ہی نہیں بلکہ تقریباً ہر ہر سطر پر مایوسیوں کو قہقہوں میں بدل کر رکھ دینے پر بھی وہ کمال عروج حاصل ہو گیا جس کے لیے لاتعداد اہل قلم عمر بھر ترستے رہے۔ اس پر مستزاد قلم میں وہ شستگی اور روانی کہ الفاظ میں بیاں ممکن نہیں۔ بس مطالعے کا ایک مرتبہ آغاز ہو گیا تو پھر مجال ہے جو قاری کا دھیان ہٹے..... یوں تو جگہ جگہ قاری چونکنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن کتنی دلچسپ ہوتی ہے وہ چونکاہٹ جب قاری کو یکدم احساس ہوتا ہے کہ کتاب تو اختتام کو پہنچی اور وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ راقم الحروف چونکہ اس مرحلے سے گزر چکا ہے اسی لئے جو دل پہ گزری وہ رقم کرنے میں کوئی عار نہیں۔ اس لحاظ سے اگر مظفر بخاری کی ادبی و فنی مسیحائی کا برملا اعتراف کیا جائے تو بھی شاید ان کی ادبی و صحافتی خدمات کو احاطہ تحریر میں نہ لایا جا سکے کہ ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہیں ہوا''۔

☆☆☆☆☆

# ''ہیر فرحت شاہ'' ایک مطالعہ

پڑھ بسم اللہ شروع ہیر کراں لکھ لکھ کے رکھاں چھاں تے
انج بول سکھایا ماں مینوں جیویں نقش بنیندں بانہہ تے
جس اکھر پاک سکھایا ہم قربان ونجاں اس ماں تے
میں جینا مرنائے فرحت شاہ ہن ماں بولی دے ناں تے

.....

فرحت عباس شاہ میں ایک بے چین روح پھرتی ہے جو ہر وقت کچھ نہ کچھ نیا کرنے کے بارے میں سوچتی رہتی ہے ان کا فلسفہ ہے کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونا چاہیے جس کام کو آپ کل پر ٹال رہے ہیں وہ آج بھی تو کیا جا سکتا ہے ٹائم مینجمنٹ کے حوالے سے جتنے وہ حساس ہیں بہت کم کم لوگ دیکھے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے 40 سالوں تک پہنچتے پہنچتے 70 کتابوں کے مصنف بن چکے تھے فرحت عباس شاہ چونکہ جینوئن تخلیق کار ہیں اس لیے ان کی ساری زندگی کچھ نہ کچھ نیا اور اچھوتا کرنے کی سعی میں بسر ہوئی ہے ان کی تخلیقی قوت اور تخلیقی وفور ان کو بے چین رکھتا ہے جو لوگ ان کے قریب ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کا ذہن کمپیوٹر سے بھی تیز چلتا ہے میں بڑے وثوق اور پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہنے کی بھی جسارت کرتا ہوں کہ عہد حاضر میں فرحت عباس شاہ شعری، فکری وفنی لحاظ سے اپنے تمام ہم عصرین سے ممتاز نظر آتے ہیں میں ان کے لیے صرف شاعر کا لفظ استعمال نہیں کر رہا ہوں بلکہ تخلیق کار کہہ رہا ہوں کیونکہ کوئی بھی شخص شاعری کے اوزان اور رموز سیکھ کر

فیصل زمان چشتی

خیال کی ترتیب بدل کر الفاظ کو آگے پیچھے کر کے شاعر کہلوا سکتا ہے اور آج کل ایسے شاعروں کی بھرمار بھی ہے جبکہ تخلیق کار کے معنی کچھ اور ہیں تخلیق کار وہ ہستی ہوتی ہے جو لوگوں کو نئی سوچ دے، نئی فکر دے، نئے راستے دکھائے، نئی منزلوں کا پتہ دے اور نئے امکانات دریافت کرے۔ ہیر فرحت شاہ ایک ایسا تخلیقی شاہکار ہے جو پنجابی ادب میں ایک منفرد اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ میرے خیال میں جھنگ کا بیٹا ہونے کے ناطے ان کے لاشعور میں یہ بات بیٹھ گئی تھی ہیر لکھنا ان کے لیے ضروری ہے اس لیے انہوں نے پنجابی زبان و ادب کو ہیر فرحت شاہ جیسا شاہکار عطا کیا قدرت نے فرحت عباس شاہ کی طبیعت میں مزاحمت رکھ دی تھی یہی وجہ ہے کہ پہلے دن سے ان کی شاعری میں دکھ، درد، کرب اور اداسی کے ساتھ ساتھ مزاحمت کی بھی اچھی خاصی مقدار موجود تھی وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ ان کی مزاحمت بھی بڑھتی گئی اور پھر آپ سب نے دیکھا کہ تقریباً تین سال پہلے ان کا ایک اردو میں شعری مجموعہ ''مزاحمت کریں گے ہم'' منصۂ شہود پر آیا۔ جس میں ان کی جرأت، ہمت اور بے باکی اپنے اوج کمال پر نظر آتی ہے۔ ہیر فرحت شاہ میں بھی مزاحمتی شاعری ہے جس میں انہوں نے معاشرتی اقدار، ارد گرد کا ماحول اور سماجی رویے انتہائی بے ساختگی، فنی مہارت اور عصری شعور کے ساتھ طشت ازبام کیے ہیں اور مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی عار نہیں ہے کہ ہیر فرحت شاہ مزاحمت کریں گے ہم کا پنجابی ورژن ہے کیونکہ اس ہیر میں مزاحمت کریں گے ہم والا رنگ غالب ہے بلکہ کچھ کچھ جگہوں پر تو جو بات وہ مزاحمت کریں گے ہم میں نہیں کہہ سکے ہیر فرحت شاہ میں بڑی سہولت سے کہہ گئے ہیں:

بے حسی، دروغ فروغ پایا اتھے گنگ تے انھ مزاج بن گئے
چور چتر چالاک عظیم ہوئے اتوں دل فریب رواج بن گئے
صوفی، ملاں، سیاسی دا فرق مٹیا، واہ، دم درود علاج بن گئے
ٹوٹے ہوئے سلوک لوک سارے اُتے لگے ہزار ساج بن گئے

..............................

ہر عہد کی اپنی ضروریات اور ترجیحات ہوتی ہیں اگر ادب حالات اور معاشرے کے تقاضے پورے نہ کرے تو آؤٹ ڈیٹڈ ہو جاتا ہے اور آج کل کے حالات یہ تقاضا کرتے تھے کہ ہیر اس سلیقے اور ڈھب سے لکھی جائے کہ جس میں سماجی و معاشرتی رویے، غریبوں کا استحصال کرنے والے عناصر پر بات کی جائے اور نشاندہی کی جائے تاکہ معاشرے میں بگاڑ کے بجائے توازن کی صورت قائم رہ سکے۔ طبقاتی تقسیم نے ہمارا سماجی معاشرتی ڈھانچہ تباہ کر دیا ہے امیر امیر ترین اور غریب غریب ترین

بنتا جا رہا تھا ہے اور اس کے ساتھ ان کے درمیان خلیج بھی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اس کتاب میں اختیارات کا ناجائز استعمال، فریب، لالچ کینہ، بغض اور حسد جیسی قاتل برائیوں کا رونا رویا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ ہیر وارث شاہ کی فکری وفنی عظمت کا اعتراف بھی ہے، خراج تحسین بھی ہے اور وقت کی آواز بھی۔ ہیر فرحت شاہ میں فرحت شاہ نے غم حیات سے غم کائنات کا سفر طے کیا ہے اور اپنے حصے کا چراغ جلا دیا ہے۔ جس طرح ہیر وارث شاہ اپنے دور کی ثقافت اور تہذیب کے علمبردار ہے اسی طرح ہیر فرحت شاہ سیاسی شعور، سماجی بہتری، معاشرتی اقدار اور ثقافتی تہذیبی ورثے کی امین ہے یہ ایسا اظہاریہ ہے جس میں فرحت عباس شاہ نے معاشرے میں جو دیکھا جو مشاہدہ کیا اور جو واردات ہوئی اس کو الفاظ کا پیرہن عطا کر دیا جس طرح ہیر وارث شاہ کو پنجابی زبان کا خزانہ اور سرمایہ کہا جاتا ہے اور اسے پنجابی زبان کی ڈکشنری بھی کہتے ہیں اسی طرح ہیر فرحت شاہ پنجابی زبان میں وہ مرثیہ اور نوحہ ہے جس میں ہمارے معاشرے کا، ہمارے سماجی رویوں کا اور ہماری اقدار کی پامالی کا رونا رویا گیا ہے اور وہ اس میں ہماری تہذیب وثقافت اور سماجی اقدار اپنی پامالی پر دلدوز چیخیں مار رہی ہیں۔

ہیر آکھیا جوگیا سچ آکھیں، کنا جھوٹھ تے کناں اے سچ اتھے
اکھاں انھیاں گھراں نوں روز پارا، بجھے ہوئے پرہاں دے نچ اتھے
وڈاں مکھیا چنگاں دناں دی سوان، چھالے جیاں دے ٹکڑے دی تا اتھے
وڈے وڈے دناواں دی سوچ گئی، وچھال لیکھے نیں کچیاں دے گئی اتھے

.............................................

فرحت عباس شاہ اس دور نا ہنجار میں زندہ ہیں جہاں حرص، طمع، لالچ اور مفاد پرستی کو ہنر اور دانائی گردانا جاتا ہے۔ دھوکہ دینا، جھوٹ بولنا اور دوسروں کے مفادات کو نقصان پہنچانا اضافی خوبیوں میں شامل ہے ایسے زمانے میں اور ایسے عہد میں حق اور سچ کا پرچم تھامنا آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے اور لوگ بھی منافقت کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ سچ ناگوار لگنا شروع ہو چکا ہے۔ تضادات اور مفادات کی میراتھن دوڑ ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ لیکن فرحت عباس شاہ کو نہ تند ہواؤں کی پرواہ ہے نہ ہی یہ مخالف بہاؤ سے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ یہ اپنے فطری تقاضوں کے عین مطابق سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کا فریضہ پورے خلوص اور دیانتداری سے انجام دے رہے ہیں۔ ہیر فرحت شاہ میں فرحت عباس شاہ نے ان تمام عوامل اور قوتوں کا نام لے لے کر ان کی حقیقت کا پردہ چاک کیا ہے کہ وہ معاشرے میں کس قسم کا بگاڑ پیدا کر رہے ہیں۔ اسی لیے وہ معاشرے کے دگرگوں حالات کا جائزہ لینے

کے بعد کہتے ہیں کہ:

جچا ورں کھاں ظالما تجراوے کے ماڑے دا کدی انصاف کیتا ئے
نو ردلقیاں دے مال پہ کے، پک ور تے جت جا صاف کیتا ئے
کدیں بولی اوکھرے نوں سزا کائی، کدنا کے غریب نوں معاف کیتا ئے
پائی ٹوکری چاکرنی چکراں وچ، خاں محل جمارے طواف کیتا ئے

..................................

جینوئن شاعر معاشرے کا سرجن ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کا مورخ بھی ہوتا ہے اور فرحت عباس شاہ یہ دونوں کام بطریق احسن سرانجام دے رہے ہیں۔ ہیر فرحت شاہ پڑھ کر ہم عہد حاضر کا سماجی، معاشرتی، معاشی ڈھانچہ اور احوال بخوبی جان سکتے ہیں۔ ہیر فرحت شاہ پڑھنے کے بعد ہمیں ڈائیگرامز یا سروے سٹڈی کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہیر فرحت شاہ میں ابہام بالکل نہیں ہے اور نہ اشاروں کناروں میں بات کی ہے بلکہ سیدھا ٹارگٹ کیا گیا ہے۔ قاری تک اس کی ترسیل اتنے موثر طریقے سے کی گئی ہے کہ ابلاغ کا کوئی مسئلہ باقی نہیں رہا اور اس حوالے سے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔ ہیر فرحت شاہ کے ذریعے انہوں نے معاشرے کو سماجی شعور دیا اور اکثر لوگ جن اداروں یا شخصیات کا نام اشاروں یا کناروں میں پکارتے تھے انہوں نے ببانگ دہل ان کا ذکر کر کے یہ بھی ثابت کیا ہے
کہ رات جتنی بھی سیاہ ہو روشنی ظلمت کا سینہ چیر کے باہر آتی ہے اور یہ بڑی جرأت، ہمت اور دلیری کی بات ہے جو آج کل کے دور میں غیر معمولی بات ہے۔ اس کتاب میں ان کی جرأت و بے باکی اپنے بام عروج پر نظر آتی ہے اور ان کا یہی انداز ان کو اپنے عہد کے باقی تمام شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ عہد موجود میں اگر تمام شعرا اور ادبا کا متوازی مطالعہ کریں تو ہم بلا جھجک یہ کہہ سکتے ہیں کہ مزاحمتی ادب میں فرحت عباس شاہ ایک بڑا معتبر اور مستند نام اور حوالہ بن چکا ہے۔ ان کی کتاب مزاحمت کریں گے ہم، ہیر فرحت شاہ اور ان کا دیگر غیر مطبوعہ کلام جو سوشل میڈیا پر روزانہ کی بنیاد پر زیر گردش رہتا ہے میری بات کی دلیل کے لیے کافی ہے۔ ایک اور بڑی اہم بات یہ ہے کہ ان کا استدلال بہت مضبوط ہے ان کا موقف عمیق مشاہدات اور ٹھوس زمینی حقائق پر مبنی ہوتا ہے ہیر فرحت شاہ کے ذریعے سے فرحت عباس شاہ نے سماجی شعور عطا کیا ہے۔ ہیر وارث شاہ میں رومانوی داستان کے ذریعے بات کی گئی ہے
جبکہ ہیر فرحت شاہ میں رومانویت کی جگہ تلخ حقائق کو ترجیح دی گئی ہے۔ ہر دور کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں اور آج کل کے دور ستم گری میں جتنا بھی یہی تھا کہ زمانے کے جبر استبداد کا ذکر کیا جائے اور شعور آگہی کا پیغام دیا جائے:

ہیر آکھیا جوگی جی دیکھیا، کس دی نیئے تے کس دی نہ نیئے
دانشوراں دا لنڈا بازار لگیا، نال اسیں وی تانی پے تپے

پھٹ لان خیال دے سینیاں وچ، کرن ٹوٹے تے اسیں پُنجے
ساڈوں وچ پاتاں دے ریت دیاں، آکھو سجاوا پے گھنجے

.....................................

شاعری قدرت کی طرف سے ایک انعام ہے، ایک ہنرمندی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بھاری ذمہ داری بھی ہے۔ کیونکہ ایک شاعر کا کہا گیا ایک شعر قوموں کی تقدیر کے دھارے بدلنے کی قوت رکھتا ہے۔ اب یہ شاعر پر منحصر ہے کہ وہ طاقت کو کس طرح اور کہاں استعمال کرتا ہے وہ سماج کے ستائے ہوئے لوگوں کی آواز بنتا ہے، ذہنی عیاشی کے اسباب کا باعث بنتا ہے، اوچھے ہتھکنڈوں سے اس کا غلط استعمال کرنے میں راحت محسوس کرتا ہے یا لوگوں کی فکری تربیت کر کے ان کا شعور پروان چڑھاتا ہے۔ فرحت عباس شاہ عام آدمی کی آواز بنا اور ان کی فکری تربیت کا دروازہ کھولا یہ راستہ کٹھن ضرور ہے لیکن انہوں نے یہ چیلنج قبول کیا ہوا ہے ہیر فرحت شاہ کے 95 بند اور اس کا ایک ایک حرف سچائی کی داستان ہے اور اس بات کا گواہ ہے کہ ان کے احساس کی شدت اور حالات کا کرب اس کتاب میں پوری تندی اور تلخی کے ساتھ موجود ہے اور سچ کتنا بھی تلخ ہو یہ اس کو بیان کر کے ہی رہتے ہیں:

ہیر اکھیا جوگی بول بھیڑا قلم کار کیوں قلم فروش ہویا
سوچ سوچیاں سوچنے پے چلے، عقل گئی تے بندہ بے ہوش ہویا

کوئی پرکھ پرچول دا ہووے لوبھا، کوئی مازا مشیم تر گوش ہویا
جتھے سیڈیا موت مزید ہووے، اوتھے ہیر داداں کی روش ہویا

.....................................

یہ کتاب ایک ایسی سچائی ہے جس میں شعری مبالغہ بھی نہیں ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہمارے معاشرے کے ناسوروں کے منہ پر زناٹے دار طمانچے کی طرح ہے جس کی بازگشت بڑی دیر تک ان کرداروں اور ذمہ داران کے ہواس باختہ رکھے گی۔

ہیر فرحت شاہ ان سارے سوالوں کا جواب ہے جو اس معاشرے کے ہر فرد کے ذہن میں کلبلاتے ہیں اس کتاب میں ان تمام لوگوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو اس معاشرے کے اچھے اور برے کردار ہیں:

تیرے لالاں تے مالاں نے لعلاں نیں جنہے زنانیاں نوں کُلّی خوار کیتا
نے منافقے انہے نے جیہ ہوئے جنہے انساناں تے آ کاروبار کیتا
تیرے سوہنے کئے پنجاب کرون تے میں آکھاں کرن انکار کیتا
فرحت شاہ نے جدّ دا بھرم رکھیا، دا شربت سوں جنہے وی وار کیتا

.....................................

اللہ پاک فرحت عباس شاہ کی استعداد اور توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے تاکہ یہ اسی جرات و بیباکی اور استقامت کے ساتھ ظلم کے خلاف نبرد آزما ہو کر مزاحمت کا پرچم لہراتے رہیں۔۔۔

☆☆☆☆☆

# اُردو فلمی شاعری کا عروضی تجزیہ

آفتاب خان کی تحقیقی کتاب ''اردو فلمی شاعری کا عروضی تجزیہ اکتوبر 2022 میں منظرِ عام پر آئی اور اسے سائبان پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ اس کتاب میں برصغیر کے فلمی گیتوں کا عروض کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ عمومی طور پر یہ تصوّر کیا جاتا ہے کہ فلمی گیت صرف اور صرف فلمی موسیقاروں کی بنائی ہوئی دھنوں پر لکھے جاتے ہیں مگر آفتاب خان نے اس تصور کو رد کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ بیشتر فلمی گیت شاعری کے مُروجہ اوزان و بحور میں لکھے گئے ہیں۔ پاکستان اور بھارت میں بننے والے اکثر فلمی گیت نگار چوں کہ ادب کی دنیا سے فلمی دنیا میں داخل ہوئے تھے اس لیے انھوں نے ادبی تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے گیتوں میں عروض کا بہت زیادہ خیال رکھا لہٰذا دونوں ملکوں کی فلموں میں عروض کی رنگا رنگی بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔

آفتاب خان نے برصغیر کی تمام فلموں کے گیت سُننے کے بعد اُن میں مختلف بحور کے گیت الگ کیے اور اٹھارہ اوزان میں قریباً گیارہ سو گیتوں پر مشتمل یہ کتاب مُرتب کی ہے۔ اس میں ہر وزن کا الگ باب بنایا گیا ہے اور اُس وزن یا بحر میں لکھے گئے گیت شامل کیے گئے ہیں اس طرح یہ اٹھارہ ابواب پر مشتمل کتاب ہے، جس کے صفحات کی تعداد 240 ہے۔ اٹھارہ ابواب سے پہلے آفتاب خان نے کئی صفحات پر مشتمل ایک مضمون تحریر کیا ہے جس میں عروض کی اہمیت بتانے کے علاوہ فلمی گیتوں میں شامل چند خوبیوں اور خامیوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

برصغیر کی ایک سو سالہ فلمی تاریخ میں کسی شاعر، ادیب یا صحافی نے اس موضوع پر لکھنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ اس کام کا بیڑا عہدِ حاضر کے معروف شاعر، ادیب، فلم رائٹر اور نغمہ نگار آفتاب خان نے اُٹھایا اور کئی ماہ کی مسلسل محنت اور ہزاروں گیت سننے کے بعد اُن میں مقبول اور غیر مقبول گیتوں کا ایک انتخاب مرتب کیا، جسے فلمی شائقین اور ادبی دنیا نے بے حد سراہا، بلاشبہ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد اور انوکھا کام ہے جس کی پزیرائی ہر سطح پر کی گئی ہے۔

کتاب کے صفحہ 5 پر'' آفتاب خان کی حیرت

مسعود تنہا

انگیز کام" کے عنوان سے (مرحوم) اظہر جاوید اپنی رائے میں لکھتے ہیں۔ "آفتاب خان نے جدت یہ کی ہے، نہ نغموں کی شعریت کو کسوٹی پر پرکھا ہے اور نہ موسیقی کے رموز کو کھنگالا ہے۔ ایسی نئی بات اُجالی ہے کہ بندہ حیرتی رہ جاتا ہے۔ انھوں نے فلمی گیتوں کی عروضی بحروں کو ہدف بنایا ہے۔ یہ عجیب ہی نہیں انوکھی بات ہے۔ اُنھیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ اکثر گیت بنی بنائی دُھن پر لکھے جاتے ہیں۔ جن گیتوں کی تخلیق کے بعد دُھن بنتی ہے اُن میں بھی ماتروں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کسی لفظ کو دبالیا، کسی کو کھینچ تان کے پورا کرلیا۔ ایسے میں عروض کہاں سے آگیا؟ آفتاب خان نے یہ کام کر دکھایا ہے۔ وہ کام جو کہنہ مشق اساتذہ کے دانتوں میں پسینہ لے آئے، انھوں نے سہولت سے کرلیا۔"

"اُردو فلمی شاعری کا عروضی تجزیہ" کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ فلمی دُنیا سے ادب کی دنیا کے بہت بڑے بڑے شاعر وابستہ رہے مثلاً ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، مجروح سُلطان پوری، کیفی اعظمی، تنویر نقوی، قتیل شفائی، طفیل ہوشیار پوری، حبیب جالب اور دیگر درجنوں شاعروں نے فلمی گیت نگاری میں ادب اور زندگی کے مختلف رنگ بکھیرے ہیں جس کی وجہ سے فلمی گیتوں میں نہ صرف ادبی رنگ نمایاں رہا بلکہ عوامی انداز بھی اپنی چھب دکھاتا رہا۔ سو اس کتاب میں مشہور و مقبول گیتوں کے ساتھ ساتھ بعض ایسے گیت بھی ہیں، جو مقبول تو نہیں ہوئے مگر اُن میں ادبی رنگ بھی موجود ہے اور وہ عروض کے تقاضے بھی پورے کر رہے ہیں۔

آفتاب خان نے جہاں خود کو ایک شاعر کی حیثیت سے منوایا ہے۔ وہاں اُس نے فلمی گیتوں کا عروضی تجزیہ کر کے اپنی ایک الگ پہچان بنالی ہے۔ بلاشبہ فلمی یا ادبی تاریخ میں اس نوعیت کا کام پہلے کبھی نہیں ہوا ہے۔ اس کام کے آغاز سے فلمی گیتوں کو ایک ادبی حیثیت ملنے کا راستہ بھی کھلا ہے اور گیتوں کی اہمیت و افادیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

آفتاب خان نے اس کتاب میں فلمی گیتوں کے انتخاب سے پہلے پندرہ صفحات کا ایک مضمون بھی شامل کیا ہے جس میں اُس نے عروض کی اہمیت بیان کرنے کے علاوہ اس بات کا بھی جائزہ لیا ہے کہ فلمی گیتوں میں بہت ساری خوبیوں کے ساتھ ساتھ چند فنی خامیاں بھی موجود رہی ہیں۔ جنھیں فلمی ضرورت سمجھ کر جائز قرار دیا گیا ہے۔ انھوں نے اس کی مختلف مثالیں بھی پیش کی ہیں جیسے کہ گیت میں "شتر گر" یہ آجانا یعنی گیت کے ایک مصرعے میں کسی کو آپ کہا گیا تو اُسی شعر کے دوسرے مصرعے میں اُسے تم یا تُو کہہ کر بلایا گیا یا پھر ایک مصرعہ میں ہم اور دوسرے میں مَیں کہا گیا تو اسے شتر گر یہ کہا جاتا ہے یعنی یہ ایک طرح کا فنی عیب ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح بعض گیتوں کا حوالہ دیا گیا ہے کہ جن میں شاعروں نے

کسی لفظ کا تلفظ بدل ڈالا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بہت سے فلمی گیت یا غزلیں شاعروں کی کتابوں سے لے کر فلموں میں شامل کی گئی ہیں مثلاً داغ، غالب، میر، اقبال، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، قتیل شفائی، سیف الدین سیف، حبیب جالب، ظہیر کاشمیری وغیرہ کا کلام یا فیض احمد فیض، احمد فراز وغیرہ کی غزلیں کتابوں سے منتخب کر کے فلمی گیتوں میں تبدیل کی گئی ہیں۔

''اردو فلمی شاعری کا عروضی تجزیہ'' میں ایسے گیتوں کی تعداد زیادہ ہے جو ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں اور اب بھی اگر اُن میں سے کوئی گیت کسی گلی میں گونج رہا ہو تو چلتے قدم رُک جاتے ہیں۔ اُن گیتوں کی نہ صرف موسیقی دل نواز ہے بلکہ شاعری بھی دل موہ لینے والی ہے لہٰذا اگر کوئی شخص صرف فلمی گیتوں کی شاعری پڑھنے کے لیے بھی یہ کتاب اُٹھالے تو وہ ان گیتوں کے مکھڑوں سے پورا پورا لطف اٹھا سکتا ہے اور اگر کوئی نوجوان شاعری کے اسرار و موز سیکھنا چاہتا ہے تو اُسے میں عروض سکھانے میں یہ کتاب معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

برصغیر کی سو سالہ فلمی تاریخ میں فلم کے حوالے سے تو بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں زیادہ تر کتابیں مختلف فنکاروں یا تکنیک کاروں کی ذاتی زندگی کے حوالے سے تحریر ہوئی ہیں، مگر آفتاب خان کی یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد اور جداگانہ کاوش ہے۔ فلمی گیتوں کے شائقین کے لیے یہ ایک نادر و نایاب تحفہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ اپنے موضوع کے حوالے سے ایک بڑی کتاب ہے جسے آئندہ کئی برسوں تک یاد رکھا جائے گا۔

معروف شاعر اور ادیب حسین مجروح نے اس کتاب کے بیک فلیپ پر لکھا ہے کہ ''جب فلمی شاعری ہی کو تنقیدی اور علمی منہاج کے لائق نہیں سمجھا گیا تو اُس کے عروضی انتقاد و تجزیہ کا کیا سوال لیکن آفرین ہے ہمارے نوجوان شاعر اور رموز شاعری کے عمدہ پارکھ آفتاب خان کے اشتیاق و استغراق پر کہ اُنھوں نے فلمی شاعری کے عروضی تجزیے کا کشٹ اُٹھایا اور کس دقتِ نظر سے۔ ایک طرف تو سنجیدہ شاعری کے طالب علموں پر فلمی شاعری کی اَن دیکھی جہتوں کے دَر وا کیے تو دوسری طرف عشروں پر محیط اُس انتقادی بے اعتنائی کا ازالہ بھی کیا جو فلمی شاعری کو عامیانہ قرار دے کر مسترد کر دینے کی روش سے پیدا ہوئی۔ اور اس کی نخشتِ اوّل فاضل محقق و مؤلف کی عالمانہ پیش لفظ ہے جو اس کتاب کے ماتھے کا جھومر ہے۔''

اس مدلل و بھرپور اظہارِ خیال کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ صرف اتنی گزارش کروں گا کہ ادب کے طالب علم اور محققین اس کتاب سے ضرور فائدہ حاصل کریں اور اس کی مزید جہتوں پر تحقیق کریں جب کہ عام آدمی بھی اس کتاب سے ضرور بالضرور استفادہ کرے خصوصاً وہ لوگ جو پرانے فلمی گیت آج بھی تنہائی میں گنگناتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

# متن، قرات اور نتائج .....ایم خالد فیاض

ایم خالد فیاض نقاد، معلم، محقق اور شاعر ہیں۔ ایم خالد فیاض ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اردو ادب میں بے شمار ادبی خدمات سرانجام دے چکے ہیں اور ان کا یہ سفر جاری ہے۔ ایم خالد فیاض تدریس کے شعبہ سے منسلک ہیں اور بطور پروفیسر اپنے تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ اکیسویں صدی کا اہم ادبی مجلّہ ''تناظر'' جوان کی ادارت میں نکلتا رہا جو اہم ادبی حوالہ ہے۔ اس کے تینوں شماروں سے ان کی دلچسپی اور ادبی آشنائی جھلکتی ہے۔ زیر نظر تصنیف ''متن، قرات اور نتائج'' جو 2023 میں کتابی دنیا سے شائع ہوئی۔ جو اکیسویں صدی کی بہترین ادبی کتب میں شمار ہوتی ہے۔ ضخیم کتاب جوان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ جو معروف ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ انہیں یکجا کر کے کتابی صورت میں لانا ایک احسن اقدام ہے۔

تنقید کے میدان میں ایک نئی تنقیدی کتاب کا اضافہ جو اپنی الگ انفرادیت رکھتی ہے۔ اگرچہ تنقید میں کسی خیال کی تائید کے لیے درج ذیل میں سے کچھ عناصر شامل ہو سکتے ہیں، لیکن ادبی تنقید ایک پلاٹ کا خلاصہ، مصنف کی سوانح حیات، یا محض ادب میں غلطی تلاش کرنا نہیں ہے۔

کتاب کو بہت سلیقے کے ساتھ چھ حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ جس میں آٹھ مضامین شامل ہیں۔ اس حصے میں عالمی ادب کا تذکرہ ہے۔ جس میں ٹیگور، سیفو، مارک ٹوئین وغیرہ کی تخلیقات پر مضامین قلمبند کر کے اس حصے کو دلچسپ بنایا گیا ہے۔ اول مضمون ''سیفو کی شاعری کے دیگر موضوعات'' ہے۔ سیفو یونانی شاعرہ ہے جس کی شاعری کا موضوعاتی جائزہ انتہائی دلچسپی سے لیا گیا ہے اور اس کے کلام کا بھی ساتھ مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد قاری سیفو کی شاعری میں موجود تمام پہلوؤں سے آشنا ہو سکتا ہے۔ مصنف نے اس طویل مضمون میں ان کی شاعری کے تمام موضوعات پر تحریر کر دیا ہے۔ دوسرا مضمون ''بڑھاپا، شہر اور بودلیئر'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں بودلیئر اپنی شاعری میں بڑھاپا اور شہر کے حوالے سے بے بسی اور اس کی کرب ناک تصویر کھینچی ہے۔ جس کو انتہائی سادہ انداز

کومل شہزادی

میں مضمون نگار نے تذکرہ کیا ہے۔ مضمون ''ٹیگور کا تصورِ موت'' گیتا نجلی کے حوالے سے ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر خالد فیاض نے ٹیگور کے موت کے حوالے سے جو نظریات ہیں اُن کو انتہائی منفرد انداز میں تذکرہ کیا ہے کہ عام قاری بھی ٹیگور کے موت کے حوالے سے خیالات کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ یہ مضمون انتہائی شاندار ہے۔ مضمون ''مارک ٹوئین کی کہانی'' دعائے جنگ'' میں مارک ٹوئین کے مختصر تعارف کے ساتھ فرائیڈ کے نظریات اور مارک ٹوئین کی کہانی ''دعائے جنگ'' کا عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ مضمون ''دنیا کا پہلا پکارسک ناول'' مصنف نے اس ناول کا اور کرداروں کا عمدہ جائزہ لیا ہے۔ ''التوائے مرگ: ایک اہم ناول کا اہم ترجمہ'' اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے ساراماگو کا ناول اور مبشر احمد میر کے ترجمہ شدہ ناول کا بہت اعلیٰ انداز میں ناول کے فکر و فن کا تجزیہ کیا ہے۔ اس حصے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تمام مضامین کے آغاز میں مصنفین کا مختصر تعارف پیش کیا ہے جس سے قاری مضمون کا مطالعہ کرنے سے قبل ان تخلیق کاروں کے بارے میں جان کر اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتا ہے۔ حصہ دوم جس میں سولہ مضامین شامل ہیں۔ افسانہ کے فن اور اردو ادب کے اہم افسانہ نگاروں کے افسانوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جس میں کرشن چندر، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، امرتا پریتم، قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، طاہرہ اقبال وغیرہ شامل ہیں۔ اس حصے کا آخری اور عمدہ مضمون ''نائن الیون اور اردو افسانہ'' ہے جس میں ایسے افسانوں کا تذکرہ ملتا ہے جن میں نائن الیون کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ یہ نہایت عمدہ مضمون ہے۔ حصہ سوم جس میں پانچ مضامین شامل ہیں۔ جو گوشہ منٹو ہے۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں کو بہت شاندار انداز سے موضوع بنایا گیا ہے۔ حصہ چہارم جس میں دس مضامین شامل ہیں۔ اس حصے میں شاعری پر مشتمل مضامین ہیں۔ ان مضامین میں مرثیہ کا تعین اور اقبال کی اردو مرثیہ نگاری، پیام مشرق از فیض احمد فیض، حسرت موہانی کی عشقیہ شاعری، مختار صدیقی کا تصورِ شعر، راشد کی نظم ''تعارف'': ایک تجزیہ، فیض کی چند بہترین نظمیں: میری نظر میں، غبارِ ایام: فیض کے آخری ایام کی شاعری، اختر الایمان کی نظم ''مسجد''، عجیب مانوس سلسلہ تھا: تجزیاتی مطالعہ، نثری نظم: اظہار کا ایک وسیلہ (چند اعتراضات کا تجزیہ) شامل ہیں۔ حصہ پنجم جس میں چار مضامین شامل ہیں۔ جس میں جدیدیت کی تحریک: مستقبل کے امکانات، ادبی مورخ کے لیے تہذیبی و سماجی شعور کی اہمیت، جامعاتی سطح پر

غیر افسانوی نثر کی تدریس: نیا تناظر، وارث کا حالی شامل ہیں۔ حصہ چھ جس میں دو مضامین شامل ہیں۔ فرائیڈ، جنگ، تہذیب اور انسانی جبلت، عصری تاریخ کا تقاضہ۔ ان دونوں حصوں میں مضامین کے ذریعے جدیدیت، تہذیب، تاریخ اور نفسیات اور فرائیڈ کے نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ فرائیڈ کے جنگ، تہذیب اور نفسیات کے متعلق خیالات کو مصنف نے نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

کتاب کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ فکشن، شاعری اور عالمی ادب جس پر مصنف کو عبور حاصل ہے۔

ساری کتاب ہی منفرد ہے لیکن بنا کسی تعصبانہ رائے کے پہلا حصہ اور مصنف کا انتخاب اور اس حصے کے تمام مضامین کو عمدہ انداز میں لکھنا قابل داد ہے۔ کتاب میں پہلے حصے اور آخری دو حصوں کے مضامین جو ہمیں کہیں بھی چیدہ چیدہ پہلو ہی پڑھنے کو ملیں گے لیکن اس کتاب میں بہت سے نئے موضوعات پڑھنے کو ملیں گے جو مصنف نے قاری لے لیے تنقید کے ساتھ معلوماتی مضامین بھی بنا دیا ہے۔ مصنف کا کہنا کہ یہ مضامین بہت پہلے شائع ہوئے لیکن اب یہ موضوعات قدیم ہو چکے ہیں۔ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی۔ ان مضامین اور متن میں آج بھی قاری کو تازگی ہی ملے گی۔

میں کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے رکھتی ہوں کہ ایسی کتب ادب میں کم کم ہی ہیں جو تمام تقاضوں پر پوری اُترتی ہیں۔ یہ کتاب کے حوالے سے قصیدہ نہیں پڑھا بلکہ قارئین بھی میری اس بات سے اتفاق کریں گے۔ اس کتاب سے ان کی علمی متانت عیاں ہوتی ہے۔ یہ عہد حاضر کے اہم نقاد ہیں، ان کی کتاب کے تناظر میں اگر کہا جائے کہ یہ گہرے مشاہدے، وسیع مطالعہ اور تیز نظر کی بنا پر اپنی انفرادیت رکھتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ کتاب ادب کے قاری کے لیے بہت کارآمد ہے۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ حمید شاہد اور ڈاکٹر روش ندیم جیسی ادبی شخصیات کی آرا سے بھی ہوتا ہے۔

بقول حمید شاہد:

''تنقید کی عمدہ کتاب کی یہ ہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ کچھ نیا سجھاتی ہے، قاری کی بصیرت کو معنی اور ایک رُخ دیتی ہے، کہیں کہیں ٹھوکے لگاتی ہے اور بے سُدھ پڑے شعور کو بیدار کرتی ہے۔ یہ خوبیاں اس کتاب میں ہیں۔''

ڈاکٹر روش ندیم کی رائے ملاحظہ کیجیے۔

''یہ مضامین ادبی دنیا میں ان کے شخصی وقار کے ساتھ ساتھ اردو تنقید میں اضافے کا باعث بنیں گے۔''

☆☆☆☆☆

# غزل

خالد احمد

بے وفا ہوں نہ وفادار ہوں مَیں
سچ تو یہ ہے کہ اداکار ہوں مَیں

سی دیئے اُس نے مرے ہونٹ تو کیا
اب مجسّم لب اظہار ہوں مَیں

میرے ہاتھوں میں گڑے ہیں کانٹے
پھول ہوں اور سردار ہُوں مَیں

ہر کرن ڈوب چلی صورتِ نبض
کن اندھیروں میں ضیا بار ہُوں میں

ذہن ہے سَر پہ لٹکتی تلوار
کِن عقائد میں گرفتار ہوں میں

اس لیے مجھ سے خفا ہے کوئی
اس کا ہوتے ہوئے خوددار ہوں مَیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

# غزل

اشک آنکھوں میں بارہا آئے
داستاں کیا انھیں سنا آئے

دن اِسی سوچ میں گزارتے ہیں
عمر کس موڑ پہ گنوا آئے

زیست ہے اور کرب تنہائی
محبسِ جاں سے کیا صدا آئے

یہ کسی یاد سے عبارت ہے
ورنہ جینے میں کیا مزا آئے

سُن کہ دیوارِ جاں پہ ہم کب کے
آنسوؤں کے دیے جلا آئے

سانس لینا بھی ہو گیا دوبھر
حبس ٹوٹے اگر ہوا آئے

ہم تو افسر اسی کے قائل ہیں
بات جو لب پہ برملا آئے

سید افسر ساجد

# غزل

طرح طرح کے نظام اور انتظام رہے
سوال یہ ہے، کبھی چین سے عوام رہے؟

ہمارے اُن سے مراسم رہے زمانے تک
یہ اور بات، ہمیشہ برائے نام رہے

ہم السلامُ علیکم رہے ادب کے ساتھ
وہ ایک شان سے وعلیکم السلام رہے

ہمیں وہ صرف کسی کام سے بُلاتے ہیں
خدا کرے، اُنھیں ہر آن کوئی کام رہے

بدلتی رہتی ہے لوگوں کی کیفیت لیکن
جو درد وغم ہمیں لاحق تھے، وہ مدام رہے

کڑے دنوں میں وفا دار دوستوں کی طرح
ہمارے مونس و ہمدم سبو و جام رہے

جنابِ شیخ کو ہیں ناگوار جو جو شوق
خدا کے فضل سے بندے کو وہ تمام رہے

شعور ہم نے گنوایا نہیں وقار اپنا
یہ بات الگ ہے کہ بے رتبہ و مقام رہے

انور شعور

# غزل

اگرچہ ہر قدم سو مشکلوں کا سامنا ہے
سفر میں دل جو کہتا ہے وہی رُخ تھامنا ہے

کوئی بدخواہ سو تدبیر کر لے سب پر کاہ
کسی کو دستِ قدرت نے اگر اکرامنا ہے

مسلسل بارشِ بارود کو تھمنا ہے اک دن
ہمیں بارِ دگر باغِ تبہ گلفامنا ہے

کہیں رستے میں ستانا نہیں خرگوش صورت
پہنچ کر شہرِ خیر و خواب میں آرامنا ہے

مشیّت مہرباں ہو تو سُجھا دیتی ہے خود ہی
کہاں سے پیچھے ہٹنا ہے کدھر اِقدامنا ہے

ہدف ہونا نہیں کوئی ہوس پیشہ تمہارا
تمہیں تو صرف اہلِ دل کو ہی بدنامنا ہے

درونِ حرف اک ریزہ رجا رکھنی نہیں ہے!
تو کیا تُو نے بھی عالی حُزن ہی پیغامنا ہے

جلیل عالی

# غزل

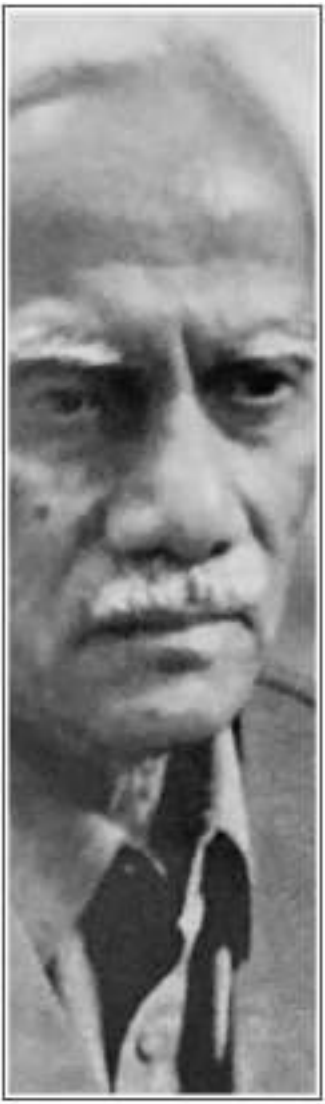

ذرا بھی میں کہیں چوکا تو ٹوٹ جاؤں گا
اسے جو دوسرا سمجھا تو ٹوٹ جاؤں گا

مرے خدا! مری آنکھوں میں نیند آنے دے
میں آج رات نہ سویا تو ٹوٹ جاؤں گا

ستا رہا ہے مجھے اب مرا اکیلا پن
رہا کچھ اور اکیلا تو ٹوٹ جاؤں گا

عجیب کرب سا محسوس ہو رہا ہے مجھے
کسی نے حال بھی پوچھا تو ٹوٹ جاؤں گا

اب انتظار سے آگے نکل گیا ہے وجود
کوئی قریب سے گزرا تو ٹوٹ جاؤں گا

اداسیاں مرے اعصاب پر مسلط ہیں
کسی نے قہقہہ مارا تو ٹوٹ جاؤں گا

میں ایک واہمے کی انتہا پہ بیٹھا ہوں
جو میں نے پہلو بھی بدلا تو ٹوٹ جاؤں گا

مجھے یقیں نہ دلا، بازیافت ہونے کا
اگر یقیں نہیں آیا تو ٹوٹ جاؤں گا

مجھے عجیب سی مہلت نے تھام رکھا ہے
اب ایک لمحہ بھی گزرا تو ٹوٹ جاؤں گا

محسن اسرار

# غزل

سامنے وہ ہے، تک رہے ہیں ہم
آنکھ تک کب جھپک رہے ہیں ہم!

حیرتی ہیں کہ اک زمانے تک
کیسے زیرِ فلک رہے ہیں ہم!

خود سے ہم بے نیاز تھے کتنے
آپ کے جب تلک رہے ہیں ہم

اُس گلی کی تلاش ہے ہم کو
گلیوں گلیوں بھٹک رہے ہیں ہم

اب اُسی پر نہیں قدم اپنے!
جس زمیں کا فلک رہے ہیں ہم

جب سے ہم سے جدا ہوا ہے کوئی
اشک بن کر چھلک رہے ہیں ہم

لمسِ دستِ صبا ہوا تھا عطا
پھول بن کر مہک رہے ہیں ہم

اُس کی یادوں کے جگنوؤں کے طفیل
ہجر کی شب چمک رہے ہیں ہم

تن بدن میں یہ آگ کیسی ہے؟
کوئلہ سا دہک رہے ہیں ہم

اُس سے قربت نصیب ہے کتنی!
اُس کے دِل میں دھڑک رہے ہیں ہم

سامنے آئنے کے وہ ہے، مگر
آئنے میں جھلک رہے ہیں ہم

دِل میں جو بات ہے نسیمِ سحر
کہنے سے کیوں جھجک رہے ہیں ہم؟

نسیمِ سحر

# غزل

کسی رنگین حسرت کی ادا کی بات کرتے ہیں
بہاروں میں ذرا موجِ صبا کی بات کرتے ہیں

چلو آنکھوں کو صحرا کی تھکن سے کھینچ لائیں ہم
چلو دریا کو چلتے ہیں گھٹا کی بات کرتے ہیں

کسی کا نام لیتے ہیں صداؤں کی حسیں رُت میں
دعاؤں کے تقدس کی وفا کی بات کرتے ہیں

کوئی تو آ ہی نکلے گا جو سینے سے لگائے گا
فضائے اجنبی میں آشنا کی بات کرتے ہیں

حدِ امکاں یقیں کا بھی کوئی تو مان رکھے گا
دیا دیوار پر رکھ کر ہوا کی بات کرتے ہیں

شبِ تاریک بدلے گی اُجالا پھیل جائے گا
خدا کی نیک بستی میں خدا کی بات کرتے ہیں

نقاب رُخ الٹ جائے تو حیرت مر بھی جاتی ہے
کسی کے شوخ آنچل کی حیا کی بات کرتے ہیں

**نثار ترابی**

# غزلیں

ادب آداب نے آکر بچایا
ہمیں محراب نے آکر بچایا

ہمیں لے ڈوبتی یہ خشک سالی
مگر سیلاب نے آکر بچایا

مجھے ہر بار دریا کے ستم سے
کسی گرداب نے آکر بچایا

اُنھی کے ہاتھ سے مارے گئے ہیں
جنھیں احباب نے آکر بچایا

مَیں آنکھیں پھوڑنے والا تھا لیکن
عدم کے خواب نے آکر بچایا

## خاور اعجاز

دستار کس طرف کو گری ، سر کدھر گیا
اسپ و شتر کدھر گئے ، لشکر کدھر گیا

صحرا میں رہ گیا ہے فقط نقشِ پائے قیس
مسند کہاں چلی گئی ، دفتر کدھر گیا

قائم ہے بُوں کی ثُوں تری بزمِ طرب مگر
ساقی ! مرا پیالہ و ساغر کدھر گیا

دیوار و در سے پوچھتا پھرتا ہُوں، ساکنو!
تم ہو اگر یہیں تو مرا گھر کدھر گیا

کنجِ لحد میں کچھ بھی میسر نہیں ہمیں
تکیہ کہاں چلا گیا ، بستر کدھر گیا

# غزل

ماضی کو بھول جاؤ نئے حال کے لئے
کچھ تو نیا ہو یار نئے سال کے لئے

تیرا تو سارا زور حفاظت پہ ہے فقط
تلوار بھی تو چاہئے اک ڈھال کے لئے

پھر اُن کے پاس ڈھانپنے کو کچھ نہیں بچا
مصرف میں لائے وردیاں جو کھال کے لئے

کوئی نہ کوئی واسطہ ان میں ضرور ہے
دوڑیں نہ ورنہ مچھلیاں یوں جال کے لئے

اہل زمانہ اور کریں بھی تو کیا کریں
مصروف ہر گھڑی ہیں نئی چال کے لیے

اے صاحب درود ترے در کی خاک ہیں
جو پڑھتے ہیں درود تری آل کے لئے

ان کے مآل کار پہ ہنستا تو ہے فلک
مر جاتے ہیں جو سعدؔ فقط مال کے لئے

سعد اللہ شاہ

# غزل

حال کیا ہو گیا چہرے کا پریشانی سے
آئنہ دیکھ رہا ہے مجھے حیرانی سے

عمر بھر ڈھویا مگر کم نہ ہوا بوجھ مرا
اس قدر لادا گیا بے سروسامانی سے

جیسے جلتا ہوا سورج ہو مرے بستر پر
ایسا محسوس ہوا ہے تری عریانی سے

کیا خبر تجھ کو یہاں کوئی خزانہ مل جائے
خوف مت کھا مرے اطراف کی ویرانی سے

اس کو بارش میں نہاتے ہوئے دیکھا چھت پر
کھیلتی آگ نظر آئی مجھے پانی سے

خود کو دیوار سمجھتے تھے مگر موج کے ساتھ
ریت کے گھر کی طرح بہہ گئے طغیانی سے

جانے انجانے میں شاید تجھے معلوم نہ ہو
ہم نے جو لطف اٹھائے تری نادانی سے

تیری مٹی میں جو آزاد روی ہے راحت
ملتی جلتی ہے بہت گردِ بیابانی سے

راحت سرحدی

# غزل

جب آ گیا اچانک وہ شعلہ رُو چمن میں
رقصاں تھی آتشِ گُل پھولوں کی انجمن میں

ماحول کہہ رہا ہے خوشبو کی داستانیں
یہ کون بولتا ہے احساس کے چمن میں

پلکوں پہ جھلملاتے تارے پرو رہا ہوں
ہے آنسوؤں کا منظر اِس غم کے پیرہن میں

راتوں کو جگنوؤں کے لب پر ترے قصیدے
میں حُسن دیکھتا ہوں تیرا کرن کرن میں

یہ کیسی لہر گزری سوچوں کے جنگلوں سے
یہ کس کا شور گونجا خاموشیوں کے بن میں

آنکھوں میں اُس کی صورت پھرتی ہے دن ڈھلے تک
اُس کا ہی تذکرہ ہے خوابوں کی انجمن میں

جو بے وطن ہیں اُن کے دِل سے یہ کوئی پوچھے
ملتی ہے کتنی راحت انسان کو وطن میں

تیری طلب نہ جانے لے جائیگی کہاں تک
آئے ہیں دار تک تو جاناں تری لگن میں

اے دوست کہنگی کی یہ سلوٹیں نہیں ہیں
اِک داستانِ غم ہے ماتھے کی ہر شکن میں

اکثر ہنسی ہنسی میں دِل اُس نے توڑ ڈالا
یکتا ہے وہ ستمگر بے مہریوں کے فن میں

میں خوں سے زندگی کی سچائی لکھ رہا ہوں
کچھ آگہی کی لَو ہے اقبال میرے فن میں

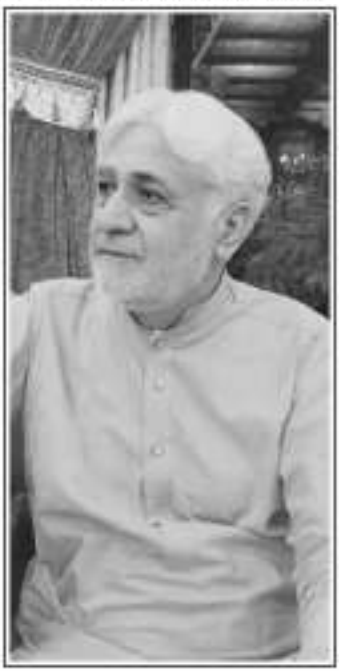

اقبال سروبہ

# غزل

زرد پتوں سے ، خشک شاخوں سے
زندگی کھیلتی ہے لاشوں سے

شورِ ماتم سنائی دیتا ہے
کون نکلا ہے اِن حصاروں سے

ایک قحط الرّجال ہے گویا
لوگ لپٹے ہیں یوں مزاروں سے

بھوک ہی بستیاں اُجاڑ گئی
کیا ملا ایٹمی دھماکوں سے

نفرتوں کا حساب لینا ہے
خانوادوں ، نواب زادوں سے

بادلوں نے نگل لیا سورج
اب نکل آؤ سائبانوں سے

محمد انیس انصاری

# غزل

حوصلہ ہارو نہ تکمیلِ سفر ہونے تک
دستکیں روکو نہ دیوار میں در ہونے تک

تبصرے سب ہیں غزہ تیرے کھنڈر ہونے تک
وادیِ سبز ترے خون میں تر ہونے تک

اپنے آنسو کو ذرا آنکھ کی سیپی میں سنبھال
وقت درکار ہے اشکوں کو گہر ہونے تک

ناگنیں رات کی پھنکارتی پھرتی ہیں یہاں
ہم نہ مر جائیں چراغوں کو خبر ہونے تک

اُن کی جیبوں میں ہی آتے ہیں لفافے بھاری
جو حقیقت کو بدلتے ہیں خبر ہونے تک

اُس نے جاتے ہوئے یہ مجھ سے کیا تھا وعدہ
لَوٹ آؤں گا درختوں پہ ثمر ہونے تک

شام کے ساتھ ہی دل ڈوبنے لگتا ہے مرا
جانے کیا چاند پہ گزرے گی سحر ہونے تک

ایک انگڑائی زمیں لے تو غضب ہوتا ہے
دیر لگتی نہیں بستی کو کھنڈر ہونے تک

غم کے پودے کو کبھی دل میں لگانا نہ عقیل
ایک پل چاہیے بس اس کو شجر ہونے تک

عقیل رحمانی

# غزل

نہر نکالی پانی چھوڑا آنکھوں سے
ہم نے دل کا پتھر توڑا آنکھوں سے

بس دو چار سمندر بھر کے بیٹھا ہوں
کام لیا ہے کتنا تھوڑا آنکھوں سے

ہوش ربا انگڑائی لی کچھ خوابوں نے
دیکھ کے ایک عروسی جوڑا آنکھوں سے

رگ رگ میں کیا سناٹے کا عالم ہے
دل کا سارا خون نچوڑا آنکھوں سے

وہ بھی تو اک حشر اٹھانے آیا تھا
جس دریا کو واپس موڑا آنکھوں سے

بہتر تھا کچھ اور جھکاتے نظروں کو
مفت میں ہم نے ماتھا پھوڑا آنکھوں سے

رکھ کر دل پہ دونوں ہاتھ دباتا ہے
اکثر وہ بندوق کا گھوڑا آنکھوں سے

تو آئے نہ آئے ہم تو چنتے ہیں
تیری راہ کا اک اک روڑا آنکھوں سے

ایک ادھورا خواب گرا کر رستے میں
بھاگ گیا پھر نیند کا گھوڑا آنکھوں سے

مسعود احمد

# غزل

لمحوں کی خالی کوکھ کو حل دے نہیں سکے
ہم لوگ زندگی کو وہ پل دے نہیں سکے

بے حس کھڑے ہیں، طاق پہ جیسے کھڑی گھڑی
پھر آج اپنے آج کو کل دے نہیں سکے

بے حرف و لفظ و مصرع و شعر و غزل حیات
آواز کی لکیر کو بل دے نہیں سکے

آہو کی آہ جس سے قلمبند کر سکیں
اردو زبان کو وہ غزل دے نہیں سکے

سب مطمئن نہیں تھے خداوں سے، سو انھیں
معزول کر چکے ہیں، بدل دے نہیں سکے

کیچڑ تو بھر رہے تھے مسلسل با اہتمام
پر جھیل کو ہنوز کنول دے نہیں سکے

ہم سلسلۂ شوق میں بیعت نہ تھے انیم
دستِ طلب میں دستِ اجل دے نہیں سکے

ابو طالب انیم

# غزل

اِک اَور آئنے کا طلبگار آئنہ
خود سے ہُوا ہے برسرِ پیکار آئنہ

ہوتا نہیں پس منظروں کی قید سے رہا
کب سے ہے اپنی راہ کی دیوار آئنہ

پتھری چپ لگی ہوئی اِس کے لبوں پہ ہے
کیسے کرے گا دَرد کا اظہار آئنہ

اِن ساعتوں میں ہر کوئی پتھر مثال ہے
اک آئنے کی دوسرا تکرار آئنہ

اک بار عکسِ یار ہویدا ہوا تھا پھر
دیکھا خیالِ یار میں سو بار آئنہ

عظمی دو چار پل کی بھی فرصت نہ مل سکی
کیا کیا تھا موڑ موڑ طرح دار آئنہ

اسلام عظمی

# غزل

آہی جاتا ہوں کبھی رات اگر کاٹنے کو
دوڑتا ہے تری فرقت میں یہ گھر کاٹنے کو

اس کی یادوں کی بھی گٹھڑی رہے اسباب کے ساتھ
زادِ رہ لے کے چلو گھر سے سفر کاٹنے کو

ہو گئے کتنے پرندوں کے گھرانے بے گھر
ایک ہی کاٹا تھا تم نے تو شجر کاٹنے کو

یہ جو تحریر پہ ، تقریر پہ پابندی ہے
ایک چکر ہے مری سوچ کے پر کاٹنے کو

ہے کسی اک کا بھی ان میں سے شجر پہ احساں
جتنے لپکے ہیں یہاں ہاتھ ثمر کاٹنے کو

کر کوئی کام ، رہے نام ، وگرنہ اکرم
کاٹ ہی لیتا ہے جیون تو بشر کاٹنے کو

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اس شہر میں حدِ رم و رفتار کہاں تھی
زندانِ ستم کی کوئی دیوار کہاں تھی

# غزل

رنج دل پہ ہر لحظہ پیار میں اُٹھاتا ہوں
جانے کس سبب سے میں پھر غزل سناتا ہوں

کاش میرے ہم رہ ہو شاعری کے آنگن میں
پھول تیری غزلوں کے جب بھی میں کھلاتا ہوں

قوس سات رنگوں کی آسماں پہ ہنستی ہے
جب تمھارے چہرے کے رنگ ہیں چراتا ہوں

گہرے پانیوں میں بھی کشتی ڈگمگاتی ہے
ساحلوں کے پہلو میں خواب جب بہاتا ہوں

پوچھتی ہیں لہریں بھی ساحلوں سے لگ لگ کر
نام کس کا لکھ لکھ کر خود ہی پھر مٹاتا ہوں

سامنے تو ٹھہرا ہے دن کا جگمگاتا پل
ہر گھڑی اویس اپنے دیپ کیوں جلاتا ہوں

اویس الحسن

# غزل

ہم نے تکیہ کیا سہاروں پر
ناچنا پڑ گیا اشاروں پر

اک پرندے نے گیت کیا گایا
ٹوٹ کر آ گرے ہزاروں پر

خواب لہروں کو کون سمجھائے
ریت ہی ریت ہے کناروں پر

آسماں پر ہی کیوں چمکتے ہیں
غصّہ آتا ہے چاند تاروں پر

تیری آنکھوں کو دھیان میں رکھا
بات کو ہم نے جب ستاروں پر

باغ میں پھول سیر کو آئے
رنگ آنے لگا بہاروں پر

کیوں چھپاتا ہوں زخم ، مت پوچھو
حرف آتا ہے اپنے پیاروں پر

طالب انصاری

# غزل

میرے ہونٹوں پہ ترا ذکر صنم رکھا ہے
اور تو نے رہِ نفرت میں قدم رکھا ہے

کیسے اپناؤں تجھے جان ہمیشہ کے لئے
کیا کروں فکر میں احساسِ عدم رکھا ہے

بسترِ مرگ پہ جینے کی تمنا تھی مری
زندگی میں نے ترا یوں بھی بھرم رکھا ہے

دیکھ عظمت مری وہ عرش پہ اب تک میرا
صورتِ کاہ کشاں نقشِ قدم رکھا ہے

آسماں ہوتا ہے کیوں روز ہی شبنم افشاں
اس کے سینے میں بھلا کون سا غم رکھا ہے

تھرتھرا اٹھتا تھا سنتے ہی مرا نام جہاں
کیا تری ذات میں بھی ایسا حشم رکھا ہے

تجھ سے آغازِ محبت یہ ہوا ہے یا پھر
درد نے دل میں دبے پاؤں قدم رکھا ہے

کیا ہوا چھن گئی جو ہاتھ سے تلوار مری
جیب میں میری ابھی میرا قلم رکھا ہے

کیوں نہ تعظیم کرے عشق کی میرے دنیا
میں نے دل اور دماغ اپنا بہم رکھا ہے

اس لئے ذہن دباؤ سے بچا ہے میرا
حلقہ احباب کا میں نے بڑا کم رکھا ہے

ذکی طارق

# غزل

جو زمیں زاد کے ادراک میں آیا ہوا ہے
ذکر اس نور کا افلاک میں آیا ہوا ہے

دل کے اندر تھا نہاں میری فقیری کا طریق
آج باہر اسی پوشاک میں آیا ہوا ہے

اس تیقن پہ کہ ہے رزق مقرر میرا
فقر و فاقہ مری خوراک میں آیا ہوا ہے

جس کے چرچے تھے کسی وقت زمانے بھر میں
شہرِ گل آج وہ خاشاک میں آیا ہوا ہے

اس پہ قبضہ ہے کسی زور زبردستی کا
ذکر جس کا مری املاک میں آیا ہوا ہے

اس کڑی دھوپ میں سایہ ہے کسی گیسو کا
پھل یہی دامنِ صد چاک میں آیا ہوا ہے

اس کی تعبیر ہوئی آہ میں توقیر رقم
خواب جو دیدۂ نمناک میں آیا ہوا ہے

توقیر احمد شریفی

# غزلیں

خوشبو کی مثل قریہ بہ قریہ بکھر گئی
اس عشقِ نامراد کی ہر سُو خبر گئی

جچتی نہیں ہے کوئی بھی صورت نگاہ میں
لیکن وہ اک نگاہ جو دل میں اُتر گئی

اتنے ہیں راہِ عشق میں کانٹے بچھے ہوئے
اس پر چلی تو زندگی مختصر ، گئی

قریہ نہیں تھا کوئی بھی ویران ، بے چراغ
لیکن شبِ فراق ، سدا اپنے گھر گئی

ہم کو تو اپنے عشق پہ ہرگز نہیں تھا ناز
اُس حسن کی رعونتِ بے جا کدھر گئی

اب کاروانِ عشق میں دم خم نہیں رہا
اب کے دلوں سے آرزوئے مستقر گئی

ہر لحہ رنج و غم سے پڑے جس کا واسطہ
کیسے کہے وہ زیست، سکوں سے گزر گئی

ان کو جدا کیا ہے گو خود سے مگر، انھیں
دیکھا وہاں تلک ہے، جہاں تک نظر گئی

شوکت، بھلا چکے ہیں زمانے کے سب ستم
اک یاد ہے کسی کی جو دل میں ٹھہر گئی

## شوکت محمود شوکت

لطف ، ایسا بھی کسی یاد نے بخشا دل کو
ہم نے خلوت میں بھی دیکھا نہیں تنہا دل کو

وقت پڑنے پہ وہی لوگ، ستم گر نکلے
درس دیتے تھے جو الفت کا، وفا کا دل کو

ہم تو سمجھے تھے کہ مجنوں کا مقلد ہے، مگر
راس آیا نہ کسی طور بھی صحرا دل کو

شام ہوتے ہی اداسی کا سماں چھا جائے
جانے کیا روگ لگا ہے بھلا ایسا دل کو

نہ رہی ہائے! زمانے میں وفا کی توقیر
نہ رہا حیف! محبت پہ بھروسا دل کو

قعرِ دریائے محبت میں ہوا ، غوطہ زن
معجزہ اب کے بچائے کہ کرشمہ دل کو

زندگی، جانبِ انجام رواں ہے، شوکت
ہر گھڑی موت کا رہتا ہے سودھڑکا دل کو

# غزل

ہے معلق ابھی دعا میری
آہ اب بھی ہے نا رسا میری

کتنے اونچے ہیں بام و در تیرے
لوٹ آتی ہے ہر صدا میری

کیا تماشا ہے یہ مسیحاؑ
مجھ سے روٹھی ہے کیوں شفا میری

انکساری مرا تفاخر ہے
ڈھونڈتے کیا ہو اب انا میری

ہر گھڑی ہجر کا محرم ہے
ساتھ رہتی ہے کربلا میری

ہر کوئی اب مرا مخالف ہے
جب سے بگڑی ہے یہ ہوا میری

بخش دے مجھ کو پیار کی خیرات
مان بھی لے یہ التجا میری

سر تا سر عشق میرا مسلک ہے
زندگانی ہے پارسا میری

میں محبت ہوں، میں ہوں لامحدود
پوچھتے کیا ہو انتہا میری

جانے کیا بھول ہو گئی ہے جلیل
ختم ہوتی نہیں سزا میری

بیگناہی ہے میرا جرم جلیل
پوچھتے کیا ہو تم خطا میری

احمد جلیل

# غزلیں

اُکتائے لوگ غم سے تو ہمدردیاں گئیں
قدریں مٹی ہیں اور شناسائیاں گئیں

چھت پر پہنچنے تک مرا بچپن گزر گیا
جانے کہاں وہ ابر کی سب ٹکڑیاں گئیں

پہلے نبیؐ کے در پہ گیا عشق ، پھر خرد
پہلے گئی ہے چھت وہاں، پھر سیڑھیاں گئیں

اب بھوک تیرتی ہے ملاحوں کی آنکھ میں
ساحل اداس ہے کہ کہاں کشتیاں گئیں

بیزار خود سے تھا تو کہا اُس کو جانِ جاں
رسوا ہوا اگر مری تنہائیاں گئیں

کچھ حُسن ، کچھ سُخن نے تہی کر دیا ہمیں
دنیا کو جاننے کی توانائیاں گئیں

## اعجاز روشن

حالت دلِ تباہ کی اپنے رقم تو ہو
ہوتا نہیں ہے ختم مگر بوجھ کم تو ہو

سینے سے لگ کے رونے کو ترسے ہیں سب، مگر
اک فاصلہ سا ہے جو مَن و تُو میں کم تو ہو

علم و ہُنر کے اور بھی در ہوں گے وا یہاں
اک عجز میں کوئی سرِ تسلیم خم ہو تو

چھٹ جائیں سب سیاہیاں لفظوں کے نُور سے
ایسا یقیں کی سطح پہ کوئی قلم تو ہو

جل جاتی ہے خرد میں عقیدے کی تازگی
آگاہیوں پہ سایۂ دیر و حرم تو ہو

ہمدردیاں یہاں کی تعلق کے دم سے ہیں
کوئی کرم جہاں میں براہِ کرم تو ہو

دُنیا کو، تجھ کو، پیار کو، روشن کو پا سکوں
خواہش کا مجھ میں اب کوئی اگلا جنم تو ہو

# غزل

دامِ ہجراں میں گرفتار سے مطلب کیا ہے
جسم کو روح کے آزار سے مطلب کیا ہے

حسنِ مطلق پہ عملداری ہے دل والوں کی
چشمِ کم مایہ کو دیدار سے مطلب کیا ہے

دل میں آئے ہو مگر یاد دلا دوں اتنا
حسن والے ہو، تمہیں پیار سے مطلب کیا ہے

ہم نہ کہتے تھے نہیں عشق کا رستہ آساں
اب سمجھ آئی رہِ دار سے مطلب کیا ہے!

چپ رہو یار وگرنہ وہ سمجھ جائیں گے
ایک ہی لفظ کی تکرار سے مطلب کیا ہے

کھینچ لاتی ہے ہمیں حرف کی خوشبو ورنہ
اِس طرف والوں کو اُس پار سے مطلب کیا ہے

یادِ ماضی سے بندھے آتے ہیں ورنہ ہم کو
زخم خوردہ در و دیوار سے مطلب کیا ہے

ہم فقیروں کی ہے اک اور ہی دنیا آصف
ہم کو شاہوں سے یا دربار سے مطلب کیا ہے

آصف شفیع

# غزل

اَیسا نہیں کہ دامنِ خستہ نہیں کوئی
لیکن مِرے مزاج کو بھاتا نہیں کوئی

صَبر و رَضا کی بات سمجھنے کی دیر تھی
کاندھے پہ میرے جَبر کا بَستہ نہیں کوئی

صحرا کی سَمت گرم بگولے ہیں ریت کے
دریا کے راستے میں تو دریا نہیں کوئی

اِس کا دَرونِ عِشق سَدا اِختلاف تھا
اَب میں بھی اِس دِماغ کی سُنتا نہیں کوئی

مجھ سے سوال کر مِرا معیار دیکھ کر!!
ویسے بھی تیرے سامنے بَچّہ نہیں کوئی

اِس واسطے بھی شَہر بدر کر دیا گیا
مُجھ اَیسا اور دوسرا سَچّا نہیں کوئی

اِک عُمر سے میں قید کِسی آئنے میں ہوں
آنکھوں تلک رَسائی کا رَستہ نہیں کوئی

ہِجر و فراق عَہدِ گذشتہ میں رہ گئے
دنیا میں آج ویسے بھی تنہا نہیں کوئی

ہر ایک چیز شاہ کے آنگن میں ڈھیر ہے
اچھا تو اور شہر میں رہتا نہیں کوئی ؟؟

کیا اَب بھی تیرے حُسن کے چَرچے ہیں چار سو
کیا اَب بھی تیرے شہر میں تجھ سا نہیں کوئی

دانش یہ اَہلِ عِلم جِسے لامکاں کہیں
سنتے ہیں اُس مَکان کا نَقشہ نہیں کوئی

دانش عزیز

# غزلیں

دن کہ ہو رات رہنے والا نہیں
تو مرے ساتھ رہنے والا نہیں
میرے مہماں کو اتنی جلدی ہے
ایک بھی رات رہنے والا نہیں
عشق ڈھل جائے گا عجوبے میں
اب عدد سات رہنے والا نہیں
ایسا طوفان ہے کہ شاخوں پر
ایک بھی پات رہنے والا نہیں
میں نے موجوں کو دیکھ کر جانا
ہاتھ میں ہاتھ رہنے والا نہیں

کاش کہہ پائیں کہ یہ وطن عزیز
زیرِ آفات رہنے والا نہیں
ماتھے کی دیرپا شکن ہے ملال
اب تہہ ذات رہنے والا نہیں
خوں کی گردش میں دوڑتا ہوا رنج
بات بے بات رہنے والا نہیں

## رخشندہ نوید

تھکے ہارے سفر سے نکلے تھے
کھوج میں دربدر سے نکلے تھے

سبز مٹی نے کھینچا اپنی طرف
وسعتِ بحر و بر سے نکلے تھے

لوٹ جانے کے راستے مسدود
پاؤں جیسے ہی در سے نکلے تھے

کتنی لکھیں کہانیاں اب تک
کب وہ قصے نظر سے نکلے تھے

ہم تو تفریح کے ارادے سے
صاحبو اپنے گھر سے نکلے تھے

عمر خورشید سی ہو رخشندہ
نور شاخ بدر سے نکلے تھے

# غزل

جانے کس کا عکس ہوں کس خواب کی تعبیر ہوں
نقش تھی جو رات کے چہرے پہ وہ تحریر ہوں

روگ بن جائیں گے اک دن یہ انا کے فیصلے
مان بھی لوں یہ اگر میں باعثِ تقصیر ہوں

جانے کس کی بددعا ہے جو اثر جاتا نہیں
کیا ہُوا ہے کس لئے میں اس قدر دلگیر ہوں

گر کبھی مجھ سے ملے تو تم سے پوچھوں گی سبب
آج تک بے نام سے رشتے میں کیوں زنجیر ہوں

گر سمجھنا چاہتے تو پھر سمجھ پاتے نا تم؟
کہہ دیا بس مسئلہ ہوں اور بہت گھمبیر ہوں

بے نشاں رستوں پہ چلتے کٹ رہی ہے زندگی
کس کی خواہش تھی میں اور کس کی بنی تقدیر ہوں

نائیلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ڈوب پائے نہ کبھی میرے سخن کا تارا
اے خدا! میرے دُکھوں کو مری طاقت کر دے

# غزل

جذبوں کو خوش جمال نے خاموش کر دیا
یا وقت کے جلال نے خاموش کر دیا

جی تو یہ چاہتا تھا کہوں شہر بھر کا حال
لیکن ترے خیال نے خاموش کر دیا

میں دیکھنے لگا تو نظارہ نہیں رہا
یہ کس کے خدّ و خال نے خاموش کر دیا

وہ دے سکا نہ خونِ تمنّا کا کچھ جواب
اُس کو مرے سوال نے خاموش کر دیا

مجھ میں چھُپا ہوا تھا کوئی مست حال بھی
اندر کی اِس دھمال نے خاموش کر دیا

رنگوں کا اک جہان بھی تھا کینوس کے ساتھ
مجھ کو مرے کمال نے خاموش کر دیا

میں اس لیے بنا نہ سکا نقشِ ناتمام
اسی دستِ لازوال نے خاموش کر دیا

لب پر تو آ گئی تھی حقیقت مگر نوید
فتنوں کے احتمال نے خاموش کر دیا

محمد نوید مرزا

# غزل

کوئی دھن ہے جو جواں رکھتی ہے
ورنہ محفل تو دھواں رکھتی ہے

پھول کھلتے ہیں خزاں رُت میں بھی
وہ پری پاؤں جہاں رکھتی ہے

کوئی دیکھے نہ اسے حیرت سے
وہ ہواؤں میں مکاں رکھتی ہے

روز ملتے تھے جہاں بچپن میں
روز وہ پھول وہاں رکھتی ہے

سوچتا ہوں وہ حسیں دوشیزہ
اپنے ارمان کہاں رکھتی ہے

خار پلکوں میں پرو لیتی ہے
پنکھڑی پر وہ زباں رکھتی ہے

مجھ سا بے نام اسے بھایا ہے
یوں تو وہ نام و نشاں رکھتی ہے

جنگجو ہے وہ بھلے وقتوں کی
اپنے ابرو کی کماں رکھتی ہے

میں ہی مایوس اسے کرتا ہوں
مجھ پہ کیا کیا وہ گماں رکھتی ہے

اصغر علی بلوچ

# غزل

انسانیت شعار ، قبیلوں میں بٹ گئے
شیطانیت بڑھی تو پھر انسان گھٹ گئے

اب غمگسار صبح کرامت کا روپ ہے
دل تو ہمارے ظلمتِ دوراں سے پھٹ گئے

پانی تھا مثلِ رنگِ عنایاتِ گل رخاں
جو تشنگان تشنہ و حیراں پلٹ گئے

بادِ بہار شہرِ تسلی سے وہ چلی
اشجارِ خستہ آگے ہواؤں کے ڈٹ گئے

پھر عمر بھر پکارا انھیں کوئے یار نے
دنیا میں جو سدا سبقِ دار رٹ گئے

عادل ہے کس کا ہاتھ، گریبان کس کا ہے
یہ سوچ ہی رہے تھے کہ سر، یار! کٹ گئے

عزیز عادل

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اس لیے مجھ سے خفا ہے کوئی
اس کا ہوتے ہوئے خوددار ہوں مَیں

# غزل

کون ہیں؟ کیا ہیں؟ ہمارے بارے میں بتلائیں گے
ہم نہیں ہوں گے، ہمارے شعر تو رہ جائیں گے

صرف کاغذ ہوں گے تصویریں لگی ہیں جس جگہ
رفتہ رفتہ اُن کے سارے رنگ اُڑتے جائیں گے

اِس لیے بھی چاہیے وسعت کہ میری خواہشیں
لوگ میرے ساتھ میری قبر میں دفنائیں گے

اب مرے احباب سُنتے ہی نہیں ہیں میری بات
مَر گیا جس دن تو سب باتیں مری دُہرائیں گے

زندگی بھٹکی ہوئی ہے اجنبی رستوں پہ کیوں
لوگ جب پوچھیں گے تو کیسے اُنہیں سمجھائیں گے

اب ہمارے اور کتنے خواب ٹوٹیں گے ظہور
اور ہم اِس زندگی میں زخم کتنے کھائیں گے

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ خالد
بے نیاز آسماں کے رنگ میں تھا

# غزل

نہ دل ہے کوئی میرا نہ جذبات ہیں میرے
بس میرا جہنم ہے ، مکافات ہیں میرے

ہر نیکی یہاں ایک نگینہ سی جڑی ہے
فردوسِ بریں سارے مکانات ہیں میرے

تنہائی ہے ، تنہائی ہے ، تنہائی بہت ہے
تنہائی کے ساتھی یہ خیالات ہیں میرے

تُو اتنے حجابوں میں چھپا ہے مرے سائیں
آنکھوں پہ الگ اتنے حجابات ہیں میرے

دم روک کے ہونٹوں کو سیے بیٹھی ہوں کب سے
آنکھوں میں مگر کتنے سوالات ہیں میرے

**شبہ طراز**

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

ہم اپنے دل پہ کچھ نازاں تھے خالد
سو اک دن ہم کو ہونا تھا خجل بھی

# غزلیں

بڑے مشکل ہمارے راستے ہیں
ہمارے درمیاں کچھ فاصلے ہیں

اصولوں کی نہ منصف بات کرنا
اصولوں کے منافی فیصلے ہیں

کسی کو کیا یہاں سمجھائے کوئی
یہاں سب لوگ ہی الجھے ہوئے ہیں

یہ قبضے لوٹ اور چوری چکاری
سیاست داں یہ کیسے مشغلے ہیں

سنو اندھے کسی سے پوچھ لینا
یہاں سب لوگ مجھ کو جانتے ہیں

یہی خواہش ہے تیرے خواب دیکھوں
مگر قسمت میں اپنی رتجگے ہیں

جہاں عابد انہی کا معترف ہے
جو تیرے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں

## عابد معروف مغل

لوگ کہتے ہیں مندمل دکھ ہے
پر محبت تو مستقل دکھ ہے

کتنی گہری ہیں عشق کی چوٹیں
لوگ کہتے ہیں معتدل دکھ ہے

مجھ کو عادت ہے درد سہنے کی
عشق کرتا جو منتقل دکھ ہے

ہر مہینے ہی جس کا رونا ہو
گیس اور بجلی کا وہ بل دکھ ہے

کوئی عابد یہ جانتا ہی نہیں
کتنے برسوں پہ مشتمل دکھ ہے

# غزل

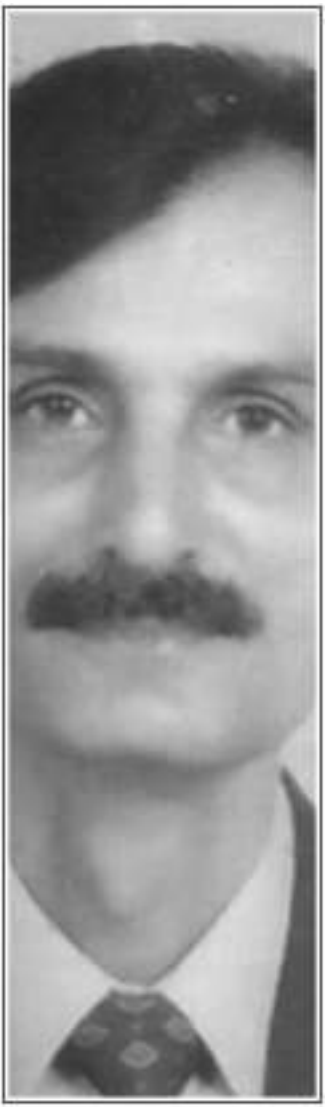

جب سفر میں ہم سفر ملتا نہیں
پھر اکیلے راستہ کٹتا نہیں

وہ بدلتے موسموں کا ہم مزاج
قول سے پھرنا ہمیں آتا نہیں

تخت یا تختہ سیاست کا اصول
درمیاں کا راستہ ہوتا نہیں

بارشوں سے گر گئے کچے مکاں
بارشوں کا سلسلہ تھمتا نہیں

دل میں جو آئے غلط ہو یا درست
کر گزرتا ہوں کبھی سوچا نہیں

میرے دشمن بھی کرینگے اعتراف
ٹوٹ کر بھی میں کبھی بکھرا نہیں

ایک عادت ہے ہماری یہ جناب
جس کو چاہا ہے اسے پرکھا نہیں

مظہر امام

# غزل

جس طرح سے سر پہ میرے سائباں کوئی نہ تھا
اک ہجوم رہرواں تھا، کارواں کوئی نہ تھا

جس کو دیکھا، دامِ ہمرنگِ زمیں میں تھا اسیر
برق خوردہ شاخِ گل پر آشیاں کوئی نہ تھا

داستانیں تو لکھی ہیں اہلِ دنیا نے بہت
داستانوں میں تو زیبِ داستاں کوئی نہ تھا

مَیں حدِ افلاک سے آگے رہا محوِ سفر
اِس فضائے نیلگوں میں آسماں کوئی نہ تھا

زندگی سے اور کیا شکوہ کریں اب اہلِ دل
دل تو تھا سینے میں، لیکن دلستاں کوئی نہ تھا

وقتِ خوشحالی بہت سے حاشیہ بردار تھے
مُشکلیں مُجھ پر پڑیں تو مہرباں کوئی نہ تھا

جعفری بے جاں اذانیں گونجتی تھیں چار سُو
تھے مؤذن ہر طرف، جانِ اذاں کوئی نہ تھا

مقصود جعفری

# غزل

سمے کے ساتھ بدلتی رہی فضائے غزل
رہی نہ ایک ہی رُخ پر کبھی ہوائے غزل

اُداس ہے تو "نوائے سروش" لے جائے
اُسے کہو کہ وہ غالب کی گُنگُنائے غزل

جنابِ شیخ بھی مستی میں آ کے کہنے لگے
ہمارے سامنے تھوڑا سا تھرتھرائے غزل

میں جانتا ہوں کہ کچھ بھی مجھے نہیں آتا
نہ میں نے سیکھا ہے کچھ بھی میاں ہوائے غزل

وہ کوئی چیز تو کھاتی ضرور ہے ، لیکن
ہماری آنکھ سے اوجھل ہے کیوں غذائے غزل

تری یہ گیت نگاری کہیں چلی جائے
میں چاہتا ہوں کہ تیرا بھی دل دُکھائے غزل

مرے سوا نہ زمانے سے بات چیت کرے
مرے سوا نہ زمانے کو منہ لگائے غزل

چلو بٹھا کے اُسے پالکی میں لے آئیں
کہ اپنے گھر بھی نہ آئے گی بن بُلائے غزل

غزل کے باب میں کوئی نہیں ہے اندیشہ
ہمارے ساتھ ہے انصر میاں دُعائے غزل

انصر حسن

# غزل

وہ سوچتے ہیں کس طرح تاجِ شہی بچے
میں سوچتا ہوں صرف مرا آدمی بچے

میں جس کے آسرے پہ ذرا سانس لے سکوں
اتنی تو اِس جہاں میں کہیں زندگی بچے

اُلجھی ہوئی ہو زیست جہاں انتشار میں
ایسی ریاستوں میں کہاں عاشقی بچے

رکھا ہے اُس نے اِس لیے خنجر زبان پر
دَب جائے میری آہ فقط خامشی بچے

دُنیا کو کیا بتاؤں کہ اپنے خیال سے
اُس کو نکال دوں تو فقط بے کلی بچے

اُٹھے ہوئے ہیں ہاتھ دُعا کے لیے مرے
دُشمن شکست کھائے مری دوستی بچے

سِل جائے میرا چاک گریباں کسی طرح
چمکے مرا لباس کہ خوش دامنی بچے

وہ چاہتا ہے سونپی ہے جس کو مہک تمام
گلشن میں کوئی پھول نہ کوئی کلی بچے

مجھ سے نبیل میرے جنوں کی ہے التجا
صحرا سمٹ بھی جائے تو اُن کی گلی بچے

نبیل احمد نبیل

# غزلیں

درد تنہائی کے انسان کو کھا جاتے ہیں
ہم ترے پاس یہی سوچ کے آ جاتے ہیں

دنیا والوں کی نگاہوں سے بچا کر خود کو
ہم تری یاد کے گوشے میں سما جاتے ہیں

کشتۂ شب ہے وہی، نام پہ جس کی ہر شام
لوگ دو چار دیے آ کے جلا جاتے ہیں

عشق کا راستہ اچھا تو ہے لیکن اس میں
روگ ایسے بھی کئی ہیں کہ جو کھا جاتے ہیں

شعر آواز نہیں چیخ نہیں ہے پھر بھی
کان جب سنتے ہیں تو درد سے بھر جاتے ہیں

## محمد اشرف کمال

اجلے چہروں کھلتے پھولوں جیسے روشن ہنستے لوگ
میری آنکھوں میں رہتے ہیں اچھی آنکھوں والے لوگ

میں کھویا کھویا رہتا ہوں، جانے کس کی یادوں میں
حیرت سے تکتے ہیں مجھ کو دن بھر آتے جاتے لوگ

اک تم ہو مجھ سے ملنے کا وقت نہیں ہے جس کے پاس
مت پوچھو ملنے آتے ہیں جانے کیسے کیسے لوگ

آسانی سے چکنی چپڑی باتوں میں آ جاتے ہیں
ہم گاؤں کے رہنے والے سادہ بھولے بھالے لوگ

اب معلوم نہیں وہ جانے کس بستی میں رہتے ہیں
آگے پیچھے چلتے پھرتے باتیں کرتے ہنستے لوگ

جیتے جی تو حال نہ پوچھا، مرنے کے بعد آئے ہیں
مرنے والوں کی قبروں پر تازہ پھول چڑھانے لوگ

ہنستے بستے شہر میں تنہائی سے مرنے والے کو
دفنانے کے لیے آئے تھے شہر کے اچھے خاصے لوگ

# غزل

آ گیا کوئی محبت کا حوالہ بن کر
شام اتری مری آنکھوں میں اجالا بن کر

جیسے کرنوں کو مقید کیا جا سکتا ہے
مطمئن ہو رہا میں چاند کا ہالہ بن کر

بہتری راہ بدلنے میں ہوا کرتی ہے
ساتھ جب چلنا پڑے پاؤں کا چھالا بن کر

کون سی راہ چلے اور یہاں پہنچے ہیں
آپ تو بھول گئے حاکمِ بالا بن کر

اپنے کردار پہ خود پیار مجھے بھی آیا
اس قدر چاہا گیا چاہنے والا بن کر

جس نے دولخت مرے دل کو کیا ہے جاذبؔ
لب پہ آئے گی نہیں بات وہ نالہ بن کر

**اکرم جاذب**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

الگ جہاں سے تھے، لیکن جہاں کے ساتھ رہے
غبار ہو کے بھی ہم، کارواں کے ساتھ رہے

# غزل

دل کو درپیش امتحان بڑے
شہر چھوٹا ہے پر مکان بڑے

دل تو کہتا ہے اعتبار کروں
ذہن میں ہیں مگر گمان بڑے

عین ممکن ہے ظرف چھوٹے ہوں
جن کے ہوتے ہیں خاندان بڑے

ایک مہمان سے ہوئے ناراض
بن رہے تھے جو میزبان بڑے

فرق پڑتا نہیں سماعت میں
چھوٹے ہوں یا کسی کے کان بڑے

ایک چھوٹا سا قافلہ میرا
دوسری سمت کاروان بڑے

منزلیں بھی نظر میں تھیں ہر دم
راستے بھی تھے درمیان بڑے

زیرِ پا جب زمیں سلامت ہے
سر پہ بھی ہونگے آسمان بڑے

اس مسافر کی جان بچ گئی ہے
جس پہ چوٹوں کے تھے نشان بڑے

موت ہے اک بڑی بلا کیفی !
کھا گئی ہے یہ نوجوان بڑے

محمود کیفی

# غزل

ہمارا تذکرہ باقی رہے گا؟
خدا جانے! خدا باقی رہے گا

سنا ہے تم ہمیں اب سوچتے ہو
تو کیا یہ سلسلہ باقی رہے گا؟

ہوائیں تیز ہوتی جارہی ہیں
گھروندے میں دیا باقی رہے گا؟

ہمارے بعد ہم سا کچھ نہیں ہے
کوئی تو آپ سا باقی رہے گا

وہ جس نے بولنا سب کو سکھایا
اُسی کا بس کہا باقی رہے گا

سمندر ساحلوں تک آ گیا ہے
بھری بستی میں کیا باقی رہے گا؟

سبھی منزل کو عاصم جاسکیں گے
سفر میں راستہ باقی رہے گا

عاصم اعجاز

# غزل

ڈر گیا ہوں میں دمِ خواب خدا خیر کرے
اک خموشی ہے سرِ آب خدا خیر کرے

میں نے جانا ہے درِ یار پہ دستک دینے
مجھ کو آتے نہیں آداب خدا خیر کرے

میں کوئی یوسفِ ثانی تو نہیں ہوں لیکن
بھائی لگنے لگے، احباب خدا خیر کرے

آخری بار ملوں اُس نے کہا ہے مجھ سے
مجھ میں اتنی ہے کہاں تاب خدا خیر کرے

ضبط کا کوہِ گراں ہے مرے شانوں پہ صغیرؔ
شل ہوئے جاتے ہیں اعصاب خدا خیر کرے

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پانی اُتر گیا ، مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

# غزل

جگہ جگہ تو وضاحت نہیں کریں گے ہم
جہاں ضروری لگے گی وہیں کریں گے ہم

نہ جانے آپ کو کس نے یقیں دلایا ہے
کہ آپ جو بھی کہیں گے یقیں کریں گے ہم

یہاں سنیں گے توجہ سے اَن کہی تیری
روایت اس کو پھر آگے کہیں کریں گے ہم

ہوا کے جشن میں شامل ہوئے تو یوں سمجھو
دیئے کو اور بھی اندوہ گیں کریں گے ہم

اب ان کے ہاتھ تو دیکھو ذرا جو کہتے تھے
ردائے وقت پہ کارِ نگیں کریں گے ہم

یہ کچھ نہ کرنا تو کافی نہیں ہے کرنے کو
کچھ اور بھی تو علاوہ ازیں کریں گے ہم

گئے ہوؤں کو رصدگاہِ دل سے دیکھیں گے
جو دور ہیں انھیں اپنے قریں کریں گے ہم

ہمارے سامنے مطلع ہے آسمانوں کا
اسی کو تازہ غزل کی زمیں کریں گے ہم

خدا کا سبزہ کہیں اور کیوں اگائیں گے
زمینِ دل کو ہی خلدِ بریں کریں گے ہم

نشہ شراب میں، جھونکا فضا میں دیکھ سکے
کچھ اتنا آنکھ کو باریک بیں کریں گے ہم

برابری کا تعلّق تو سب سے رکھیں گے
مگر غلامی کسی کی نہیں کریں گے ہم

دلوں کو بھر لیا ہم نے یہاں کے رازوں سے
دلوں کو خالی بھی شاہد یہیں کریں گے ہم

شاہد ماکلی

# غزل

یہ گھاؤ مری روح کے بھر کیوں نہیں جاتے
اور گیسوئے تقدیر سنور کیوں نہیں جاتے

اک بات ادھوری کے اثر کیوں نہیں جاتے
جو خواب اِدھر جاگے، اُدھر کیوں نہیں جاتے

جو روح میں پیوست ہیں بچپن سے ہماری
وہ خوف، وہ اندیشے، وہ ڈر کیوں نہیں جاتے

کہتے ہیں سیاہی ہے فقط رات کا حصہ
اندھیارے یہ پھر وقتِ سحر کیوں نہیں جاتے

سوچا ہے کبھی تُو نے، تری بزم سے کچھ لوگ
جانا بھی اگر چاہیں مگر کیوں نہیں جاتے

ہر روز خجل ہونے سے ہے عقل گریزاں
دل کہتا رہا بارِ دگر، کیوں نہیں جاتے

اس حالتِ غم سے تو کہیں ہوگا یہ بہتر
ہم عالمِ فانی سے گذر کیوں نہیں جاتے

ہر آن ہی گردش میں رہیں میرے سفینے
قسمت کے یہ اَن دیکھے بھنور کیوں نہیں جاتے

خالدہ انور

# غزل

ہنستے ہیں، مسکراتے ہیں آبائی شہر میں
کتنا سکون پاتے ہیں آبائی شہر میں

یادوں کے دیپ آنکھ میں روشن کیے ہوئے
کچھ دن گزار آتے ہیں آبائی شہر میں

عمرِ رواں، جو وقت کی بانہوں میں کھو گئے
جگنو وہ جگمگاتے ہیں آبائی شہر میں

فرصت ملی ہے کارِ جہاں سے ذرا سی اب
مدت کے بعد جاتے ہیں آبائی شہر میں

جو ایک دلنشیں نے سنائے تھے آج ہم
وہ گیت گنگناتے ہیں آبائی شہر میں

بچپن کے کھیل کود، جوانی کی داستاں
شاہد ہمیں بلاتے ہیں آبائی شہر میں

شاہد فرید

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آپ بھی دیں دامن کی ہوائیں
پھول کہاں تک آگ لگائیں

# غزل

[نذر اسلم کمال]

خود نام ہی خطاب ہے اسلم کمال کا
ہر نقش لا جواب ہے اسلم کمال کا

خوفِ خدا ہے دل میں محبت رسول کی
پیری میں جو شباب ہے اسلم کمال کا

قرآں کی آیتوں کو سجایا ہے اس طرح
اک حرف بھی کتاب ہے اسلم کمال کا

بخشا ہے صوفیا کے کلاموں کو وہ جمال
فن، رشکِ ماہتاب ہے اسلم کمال کا

اقبال و فیض کو دیا رنگوں کا پیرہن
کیا ذہن فیضیاب ہے اسلم کمال کا

رنگینیوں کا عکس ہے ہر سطر میں عیاں
نقطہ ہر اک شہاب ہے اسلم کمال کا

فن اس کا سر بہ سر کوئی خوشبو کا سلسلہ
گویا قلم گلاب ہے اسلم کمال کا

خود پر جو اس کو ناز ہوا تو بجا ہوا
جو رنگ انتخاب ہے اسلم کمال کا

کرتے ہیں جو ذرا بھی وطن کے خلاف بات
ایسوں سے اجتناب ہے اسلم کمال کا

جھنڈا سجا کے رکھتا ہے سینے پہ ہر گھڑی
حبِ وطن نصاب ہے اسلم کمال کا

ہر شخص اپنے فن کو اجاگر کرے یہاں
بس اک ہی اضطراب ہے اسلم کمال کا

دل میں بھری ہے حبِ وطن کوٹ کوٹ کر
دھرتی ہی انتساب ہے اسلم کمال کا

میرا وطن زمانے میں سب سے عظیم ہو
چھوٹا سا ایک خواب ہے اسلم کمال کا

اس کا خدا کی ذات پہ کامل یقین ہے
خیمہ جو بے طناب ہے اسلم کمال کا

اعزاز اس کا تائب و منذر کی دوستی
ہر لمحہ آفتاب ہے اسلم کمال کا

اتنے بنا دیئے ہیں کتابوں کے سرورق
دستِ ہنر سحاب ہے اسلم کمال کا

اس فن میں اور لوگوں نے جتنا کیا ہے کام
وہ صرف ایک باب ہے اسلم کمال کا

جس جس نے دکھ دیا وہ سمجھ لیں کہ حشر میں
ان کی طرف حساب ہے اسلم کمال کا

سرور عطا کیا گیا ذہنِ رسا اسے
ہر سانس نور تاب ہے اسلم کمال کا

سرور حسین نقشبندی

# غزل

فرسودہ روایات سے لڑتے ہوئے ہم لوگ
مر جائیں گے حالات سے لڑتے ہوئے ہم لوگ

حیرت ہے کہ اک سانس پہ قدرت نہیں رکھتے
قدرت کے کرشمات سے لڑتے ہوئے ہم لوگ

منزل پہ کسی طور پہنچ پاتے نہیں ہیں
رستوں کے نشانات سے لڑتے ہوئے ہم لوگ

پیڑوں کی پریشانی سمجھنے سے ہیں قاصر
بادل کبھی برسات سے لڑتے ہوئے ہم لوگ

بیزار تہِ خاک پڑے کب سے ملیحہ
خود ساختہ آفات سے لڑتے ہوئے ہم لوگ

ملیحہ سیّد

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لہو کی دھار نے تن روشنی میں ڈھال دیے
سروں کے ساتھ ہوا میں دیے اُچھال دیے

# غزل

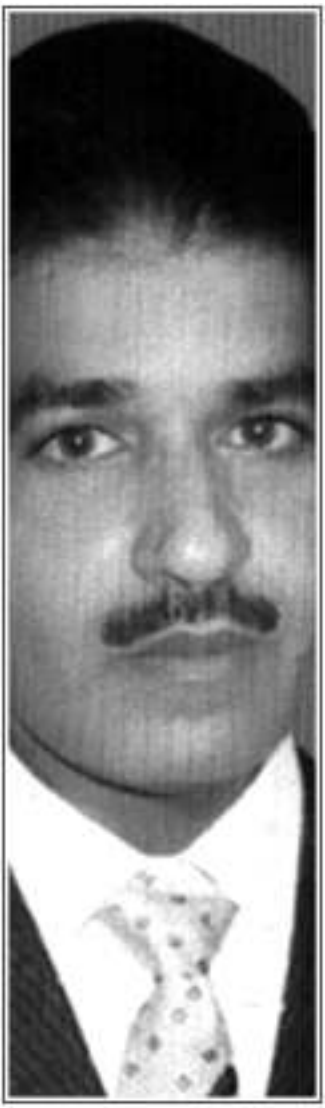

جو گلے شکوے ہیں اپنوں سے بھلاتے جایئے
درمیاں دیوار جو ابھرے گراتے جایئے

خود اتاریں گی نئی نسلیں، یہی بس سوچ کر
آپ پیہم بوجھ قرضوں کے اٹھاتے جایئے

مثلِ گل جب امرِ کن سے آپ نے پائی نمو
بن کے خوشبو ذرے ذرے میں سماتے جایئے

نور سے محروم ہے شہرِ تمنا کی فضا
کب تک آخر ظلمتوں کے دکھ اٹھاتے جایئے

کوئی بھی موسم پرندوں کے لئے اچھا نہیں
جبر کے عالم سے بس بچتے بچاتے جایئے

چاہتے ہیں گر جہاں میں آپ باعزت مقام
جھوٹ کے کانٹوں سے دامن کو بچاتے جایئے

کس طرح کٹ پائیں گے تنہائیوں کے روز و شب
جاتے جاتے کوئی صورت تو بتاتے جایئے

سرور فرحان

# غزل

دائرے میں اک سفر تھا، انتہا کچھ بھی نہیں
عمر بھر چلتے رہے اور فاصلہ کچھ بھی نہیں

ایسے ظاہر کر رہا تھا وہ، ہُوا کچھ بھی نہیں
شہر سارا جانتا تھا، اب بچا کچھ بھی نہیں

نور کے ہیں سلسلے یہ چار سُو ٹھہرے ہوئے
عالمِ ارض و سما اس کے سوا کچھ بھی نہیں

پالیا جس نے تجھے دونوں جہاں بھی پا لیے
تیرے بِن اس زندگی میں جو ملا کچھ بھی نہیں

دائروں میں رقص پر مجبور یہ اجسام سب
اک صدائے کن فکاں، اس کے سوا کچھ بھی نہیں

میر و غالب پڑھ لیے، اقبال بھی اور فیض بھی
عشق میں اس کے سوا ہم نے کیا کچھ بھی نہیں

عشق میں ہم کو ملی ہیں نسبتیں کچھ عام بھی
جب سے وہ اچھا لگا، اچھا لگا کچھ بھی نہیں

شام نے ڈھلتے ہوئے، "کیسے ہو؟" یہ پوچھا مجھے
لب مرے ہلتے رہے، میں نے کہا کچھ بھی نہیں

کس قدر سادہ ہو تم پیارے بشیر احمد حبیب
کس طرف جانا ہے کیوں؟ تم کو پتا کچھ بھی نہیں

بشیر احمد حبیب

# غزل

ظاہر سے نہیں مجھ کو سروکار مرے دوست
مَیں دیکھ رہا ہوں پسِ دیوار مرے دوست

ہر بات کہاں ہوتی ہے محتاج بیاں کی
الفت کا ضروری نہیں اظہار مرے دوست

تعظیم و ادب سے جو جھکی رہتی ہے ہر پل
ہوتی ہے وہی شاخ ثمر بار مرے دوست

ہو عزمِ جواں ساتھ جو دشوار سفر میں
ہٹ جاتے ہیں پھر راہ سے کہسار مرے دوست

انساں کو کوئی چیز بھی مرغوب نہ آئے
ہو جائے اگر خود سے یہ بیزار مرے دوست

آئے گا وہی پیش وہاں اذنِ خدا جو
بے سود ہے حالات سے تکرار مرے دوست

آشفتہ سری دیکھ کے اِس دل کی خیالی
کہتے ہیں مجھے عشق کا بیمار مرے دوست

زبیر خیالی

# غزل

جیسے ہر طرح کے نقصان برے لگتے ہیں
عشق میں وصل کے بحران برے لگتے ہیں

توڑ آیا ہوں سبھی ان سے مراسم میں بھی
تجھ کو جو لوگ مری جان برے لگتے ہیں

ایسے حالات ہوئے جاتے ہیں غربت کے سبب
گھر میں آئے ہوئے مہمان برے لگتے ہیں

خودکشی کرنے پہ مجبور ہوئے لوگ یہاں
مجھ کو اس دیس کے سلطان برے لگتے ہیں

کاٹ کر پیڑ پرندوں کو جو غم دیتے ہیں
اے خدا! مجھ کو وہ انسان برے لگتے ہیں

چومنے دیتے نہیں جالیاں روزے کی ہمیں
اُن کی دہلیز کے دربان برے لگتے ہیں

اپنے بچوں کی وہ خوشیوں کے ہیں قاتل اکمل
جن کو یہ کھیل کے میدان برے لگتے ہیں

اکمل حنیف

# غزل

زندگی شہد بھرا جام نہیں ہے کوئی
اور اس بات میں ابہام نہیں ہے کوئی

اب مجھے لوگ ترے نام سے پہچانتے ہیں
"ایسا لگتا ہے مرا نام نہیں ہے کوئی"

صبح دم رنگ بہت تھے مرے آئینے میں
اب جو دیکھا ہے سرِ شام، نہیں ہے کوئی

ایسے عشاق بھی ہیں عالمِ امکاں میں جنھیں
تیرے دیدار سے بھی کام نہیں ہے کوئی

میں نے پوچھا کہ کوئی ہے جو تجھے چاہتا ہو
چیخ اٹھا دلِ ناکام، نہیں ہے کوئی

زندگی لگتی ہے اس کارِ زیاں میں انجم
ہنرِ شعر و سخن عام نہیں ہے کوئی

**امتیاز انجم**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

خود اُلجھتا ہوں، خود سلجھتا ہوں
کچھ نکھر جاؤں، کچھ سنور جاؤں

# غزل

تھوڑا تھوڑا ہوں فرشتہ، تھوڑا تھوڑا آدمی
چاہتا ہوں میں کہ بن جاؤں سراپا آدمی

ڈھونڈتا پھرتا ہوں خود میں ایک ایسا ہم نفس
جو نہ زاہد ہو نہ عابد، بس ہو اچھا آدمی

جیسے دنیا کوئی معذوروں کی ہو جائے اماں
کوئی گونگا آدمی ہے، کوئی بہرا آدمی

اک عجب تجرید کی حالت میں ہیں ہم مبتلا
کوئی آدھا جان در ہے، کوئی آدھا آدمی

دیکھتا ہوں میں عموماً خواب میں منظر یہی
چار سو پھیلے درندوں میں اکیلا آدمی

یوں کبھی غربت کی سولی پر نہ دیتا جان میں
کاش ہوتا میں بھی کوئی ایسا ویسا آدمی

ان سا اب تک دوسرا پیدا نہیں کوئی ہوا
حیف ہم نے مار ڈالے کیسے عنقا آدمی

اب کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں کوئی سقراط میں
داستانوں ہی میں اب ملتا ہے سچا آدمی

اپنی بستی کی وبا کا پاس تھا اس کے علاج
بستیوں سے دور رہتا تھا جو کڑوا آدمی

کون جانے آدمی سے آدمی ہے دور کیوں؟
کون جانے چاہتے ہیں لوگ کیسا آدمی؟

پیاس اس کرب و بلا کی ہے کہ بجھتی ہی نہیں
پی گئی یہ خاک کیسے کیسے دریا آدمی

آنکھ سے آنسو ٹپکتے دیکھ کر مجھ پر کھلا
کتنا مشکل ہے بنانا قطرہ قطرہ آدمی

سلسلے سارے ہدایت کے مکمل ہو چکے
اور اب بھی ڈھونڈتا پھرتا ہے رستہ آدمی

میں تجسس سے مزین ایک طرفہ سانحہ
گاہے مسجود ملائک، گاہے رسوا آدمی

گویا عالم کی بہاریں اور خزائیں مجھ سے ہیں
گاہے گاہے قہقہہ اور گاہے گریہ آدمی

ہو زیارت تو میں ان ہاتھوں کا بوسہ لوں ضرور
جن کے چھو لینے سے بن جاتا ہے گارا، آدمی

علمدار حسین

# غزل

رسمِ وحشت کا ضابطہ کیا ہے
میرے جیسوں کا زائچہ کیا ہے

عشق والوں کی اپنی دُنیا ہے
شاہ کیا ہے یہاں گدا کیا ہے

کتنا چلنا ہے اور تری جانب
اس مسافت کی انتہا کیا ہے

اس لئے اوڑھ لی ہے خاموشی
مجھ کو معلوم ہے ہُوا کیا ہے

پوچھتے ہیں ہزارہا لشکر
چشمِ ساقی سے جو بٹا ، کیا ہے

اے مرے دلربائے روزِ ازل
دل محلے میں تجھ سوا کیا ہے

کوزہ گر دیکھتے ہیں حیرت سے
کیا بنانا تھا اور بنا کیا ہے

اک تو ڈھارس بندھا کے لوٹا ہوں
اور لشکر میں بانٹنا کیا ہے

جن کو خیرات تیرے در سے ملی
ان غلاموں کا مرتبہ کیا ہے

کاش کوئی پلٹ کے بتلاتا
موت کی نیند میں مزا کیا ہے

تیرا اپنا کیا دھرا ہے دوست
میری جانب یوں دیکھتا کیا ہے

تیرے دم سے ہے رونقِ ہستی
ورنہ جینے کا آسرا کیا ہے

اکثر اوقات سوچتا ہوں میں
شعر کہہ کر مجھے ملا کیا ہے

مستحسن جامی

# غزل

ایک جھرنا، ایک دریا، اک سمندر دل میں ہے
خواب آگیں اس نگر کا اک کھُلا در دل میں ہے

جھلملاتے تاروں سے لپٹی ہوئی لیلائے شب
جانے کب سے اس طرح کا ایک پیکر دل میں ہے

نیلگوں سی جھیل میں نیلا ہے عکسِ آسماں
ایک منظر آنکھ میں ہے ایک منظر دل میں ہے

حادثے اتنے ہوئے محسوس کچھ ہوتا نہیں
ایسے لگتا ہے کہ جیسے سنگِ مرمر دل میں ہے

اُلجھنیں، اندیشے، خدشے، وسوسے ہیں اس قدر
دل ضرور اک اور اس دل کے برابر دل میں ہے

ایک حُسنِ بے کراں ہے، اک ادائے بے بہا
اک تصوّر، ہر تصوّر سے جو برتر، دل میں ہے

دل گیا پر آپ دل سے جا نہ پائیں گے کبھی
یادِ ماضی، فکرِ فردا سے بھی بڑھ کر دل میں ہے

راجہ عبدالقیوم

# غزل

یاس و امید کے انبار سے آگے کیا ہے
یعنی اس وقت کی دیوار سے آگے کیا ہے

تری سن لی تجھے مل بھی لیا اے دوست مگر
تری باتوں تیرے دیدار سے آگے کیا ہے

یاد کرتے ہیں مگر یاد کریں گے کب تک
پیار کرتے ہیں مگر پیار سے آگے کیا ہے

زندگی تو نے ہمیں لا کے یہاں چھوڑ دیا
زندگی ، کوچۂ دلدار سے آگے کیا ہے

یاد رکھنا ہے کہ ہے اس کو بھلانا شوکت
سوچ لے آخری انکار سے آگے کیا ہے

**افتخار شوکت**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

پسِ لب و رُخِ اِعدا رہا مرا پیارا
نہ اُس سے جیت سکا میں، نہ مجھ سے وہ ہارا

# غزلیں

خواہش تو یہ دل میں تھی ذرا گھر سے نکلتے
اے دامِ وبا، کیسے ترے ڈر سے نکلتے
ہمراہی تو اک خواب تھی بس شوق تھا اتنا
اک بار ذرا تیرے برابر سے نکلتے
دیکھا نہیں دنیا نے مجھے ڈوبتے ورنہ
منظر کئی اس ڈوبتے منظر سے نکلتے
رکھنی تھی تجھے صبر کی بنیاد وگرنہ
دریا ترے اک پاؤں کی ٹھوکر سے نکلتے
آنکھوں میں ہماری تجھے دیکھا ہے جہاں نے
یہ نقش ترے کب کسی آذر سے نکلتے

## کاشف حیدر

ہچکچاہٹ ہے یہ بیان میں کیا
پھر کوئی آ گیا ہے دھیان میں کیا

جل گیا ہے مکاں دیے کے سبب
جل رہا تھا دیا مکان میں کیا

اس نے پوچھا ہے میرے بارے میں
کچھ حقیقت ہے اس گمان میں کیا

زخم ملنے لگے ہیں کثرت سے
آ گیا ہوں تری امان میں کیا

اس خاک سے گر خاص سی نسبت نہیں ہوتی
ہم آگے کہیں ان مہ و اختر سے نکلتے
ویرانی نے گھر کی ہمیں دہلیز پہ جکڑا
کیا چھوڑ کے تنہا اسے ہم در سے نکلتے
ہم گھومتے کچھ اور اگر چاک ازل پر
اب جیسے ہیں اس سے ذرا بہتر سے نکلتے

اتنے نزدیک آ گئے ہو مرے
بات کہنی ہے کوئی کان میں کیا

زخم ، وحشت ، لہو خرید چکا
اور کچھ ہے تری دکان میں کیا

# غزل

قربت اچھی لگتی ہے
دوری تیری ڈستی ہے

ہونٹوں پر مسکان نہیں
آنکھوں میں تو مستی ہے

سب ہیں خوش میخانے میں
سب کو وافر ملتی ہے

اس سے بات کریں کیا ہم
اس کا سخن خاموشی ہے

غم کی رات مگر اشفاق
دھیرے دھیرے ڈھلتی ہے

**محمد اشفاق بیگ**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

خالد اگر آنکھیں نہیں ، دامن ہی بچھا دے
اَب چھت سے اُترنے کو یہ سنسان سا دن ہے

# غزل

اندرُوں کچھ نہ کچھ نمی ہوئی ہے
خشک آنکھوں میں تب نمی ہوئی ہے

آج ملنے نہیں وہ آ پائے
آج بارش بھی کچھ تھمی ہوئی ہے

جم کے بیٹھے ہیں دیکھنے کو تجھے
ورنہ محفل کہاں جمی ہوئی ہے

جب سے چھوڑا ہے مجھ سے شاعر کو
اس کی پوشاک ریشمی ہوئی ہے

آنزری ملی اسے ڈگری
جس سے آنر میں کچھ کمی ہوئی ہے

**محمد ادریس قریشی**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

جمع کرتے رہ گئے مال و منال اُس کے لیے
ہم کہ اِک دُکھ بھی نہ رکھ پائے بحال اُس کے لیے

# غزل

زمیں سے دور ستاروں کے درمیاں روشن
سیاہ رات میں کب سے ہے کہکشاں روشن

شفق مثال لہو رنگ میری خاک ہوئی
عزا کی شام ہوا میرا اشک داں روشن

نشیبِ حزن میں شامِ سیاہ بخت کٹی
پھر اک چراغ ہوا شب پہ مہرباں روشن

یہیں کہیں تھا اندھیرے میں معبدِ زرتشت
قدیم آگ سے ہیں مشعلیں جہاں روشن

برہنگی نے بھی روکا نہ ارشمیدس کو
عجب گھڑی تھی ہوئی فکرِ نکتہ داں روشن

سفر نصیب ہوں میں ماہِ نیم ماہ کی شب
چراغ کہنہ سے ہے طاق آسماں روشن

تمام رات میسر ہیں پیالۂ و فنجان
گلی کے موڑ پہ اب تک ہے ریستراں روشن

ستارہ ہو کہ پرندہ ، کوئی خبر لائے
بیشگی میں ہے کیا قصرِ لامکاں روشن

عابد رضا

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

ہماری سیرتیں تھیں ایک جیسی
کوئی خوش رو ، کوئی کم رو نہیں تھا

# غزلیں

شہد کے نام پر زہر پیتے رہے
زہر پیتے رہے اور جیتے رہے

گھاؤ تیرے بھرے ہی نہیں زندگی!
زخم لگتے رہے، زخم سیتے رہے

ایک لمحہ جدائی کا صدیاں لگا
ہجر ماروں کے ہاتھوں میں فیتے رہے

وقت گزرا ہوا لوٹتا ہی نہیں
دن جو بیتے رہے، وہ تو بیتے رہے

سوکھے پتّے شجر نے گرائے وہی
جو کبھی اس کے بابرؔ چہیتے رہے

## احمد سجاد بابر

سفر میں آسرا رکھنا
ہتھیلی پر دیا رکھنا
بڑی لمبی مسافت ہے
سرِ صحرا دعا رکھنا
مسافر لوٹ جائے نا
یہ دروازہ کھلا رکھنا
بہت مصروف ہو جانا
نہ زخموں کو ہرا رکھنا
ہیں سانپوں سے بھرے رستے
حفاظت کو عصا رکھنا

کہیں کچھ پھول بو آنا
کہیں کانٹے ہٹا رکھنا
کہانی پھر سے لکھو تو
مرا حصہ بڑا رکھنا
مناسب یہ نہیں بابرؔ
یوں رشتوں میں انا رکھنا

# غزل

کھل اٹھا دل پھولوں کی مہکار سے
جب بھی دیکھا اس نے مجھ کو پیار سے

جب گلوں نے کر دیا گھائل تو پھر
کیا بچانا یار دامن خار سے

جھوٹ پر مبنی تھے سب دعوے ترے
کچھ نہ ہو پایا تری سرکار سے

لہجہ ہے تیرا کہ ہے خنجر کوئی
دل ہوئے گھائل تری گفتار سے

دشمنوں کی چال کو سمجھے مگر
بچ نہ پائے دوستوں کے وار سے

ہم کھڑے ہیں آج بھی افضل وہیں
کچھ نہ سیکھا وقت کی رفتار سے

**افضل ہزاروی**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

یُوں ملاقاتیں ادھوری چھوڑ کر جاتے نہ تھے
تم تو میری دُکھ بھری باتوں سے اکتاتے نہ تھے

# غزل

جب کھنکتی تھی تو دیوار دہک جاتی تھی
میری زنجیر سے آواز بہت آتی تھی

وہ سناتا تھا مجھے اپنی زمیں کے قصے
اور میں بھٹکے ستاروں کی خبر لاتی تھی

مجھ کو آتا تھا نظر اس میں تمہارا چہرہ
آئنہ دیکھ کے میں اس لیے شرماتی تھی

آخرِ کار محبت میں بچھڑنا ہی پڑا
تم کو اے دوست! میں اس واسطے سمجھاتی تھی

تھا ترے نام کی تسبیح کا اعجاز سمن
دنیا چل کر مری دہلیز پہ آ جاتی تھی

رخسانہ سمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یا خاک ہو جا خاک میں یا گھر بنا افلاک میں
اک دن تری دو رنگیاں ہم کو لہو رُلوائیں گی

# غزل

بزمِ قاتل سے سرِ دار ، بتا کیسا لگا
عشق آساں ہے کہ دشوار بتا کیسا لگا

جبر کی نیند میں بستی کو سلانے والے!
اب بھرا شہر ہے بیدار بتا ، کیسا لگا

دھوپ کی لو سے پرندوں کو بچانے کے عوض
کٹ گئے قیمتی اشجار ، بتا کیسا لگا

ہم نے ہر دور میں ہستی کا تماشا دیکھا
ہم ہوئے زینتِ بازار ، بتا کیسا لگا

سانحہ یہ بھی ہوا آنکھ کے ایوان کے بیچ
یار تھے دستِ ستم گار، بتا کیسا لگا

عشق میں جان جلانے کا ہنر چلتا ہے
ہوش رہتا ہے نہ پندار بتا کیسا لگا

ڈھونڈتا پھرتا ہے اب مجھ کو گنوا کر ساجد
وہ شناسا ، وہ مرا یار ، بتا کیسا لگا

سجاد حسین ساجد

# غزل

بچھڑے جو اب کی بار تو اگلے جنم ملیں
ایسے کہاں نصیب کہ تجھ سے صنم ملیں

دو چار پل نکال کے فرصت میں میرے دوست
غم بانٹنے کو شہر میں اِک شام ہم ملیں

ممکن ہے اب کے دھوپ ہو جاڑے میں جون سی
آنکھیں کسی ملال میں ممکن ہے نم ملیں

اتنا قریب دیکھ کے شک تو کریں گے لوگ
جلنے لگی ہے ساتھ سے دنیا، سو کم ملیں

کھلنے لگا ہے باب جو، ایسا نہ ہو عروج
لمحے کسی کے قرب کے دل پہ رقم ملیں

عروج دُرانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا جانیے کب خالد کس رخ ہمیں لے جائے
کیا جانیے اس در تک کیا رنگ ہوا کا ہو

# غزلیں

خِضر بن کر گیان دیتا ہے
عشق کون و مکان دیتا ہے

تُو ستم گر سہی مگر یہ دل
تیرے حق میں بیان دیتا ہے

اُس سخن ور کا دل نشیں لہجہ
چاہتوں کا گمان دیتا ہے

کشف کُھلنے لگے ہیں وحدت کے
کوئی حبشی اذان دیتا ہے

عقل کی ایک بھی نہیں چلتی
جب جنوں دو جہان دیتا ہے

چادریں بیٹیوں کے سر پر ہوں
یہ سلیقہ امان دیتا ہے

عصمتیں اس لیے ہیں خطرے میں
جگ مزاروں کو مان دیتا ہے

محبت سے ملے یا بے دلی سے
نہیں بنتی ہماری زندگی سے

یہ کیسا دور ہے ، ملتا نہیں ہے
ضرورت کے بنا کوئی کسی سے

ریاضت کی یہاں وقعت نہیں ہے
سو میداں مار لیجے دھاندلی سے

ہے خوش فہمی کہ لب آزاد ٹھہرے
شکایت بھی کریں تو خامشی سے

بہت شائستہ لہجے دلکشی سے
اگلتے جھوٹ ہیں دریا دلی سے

لہو اہلِ قلم کا ساکشی ہے
اندھیرا ڈر رہا ہے روشنی سے

**ردا حاصل خلوص**

# غزلیں

نفرتیں ہیں دلوں میں ابھی
ہر کوئی بے سکوں ہے تبھی

پاؤں میں آبلے پڑ گئے
چھاؤں تک مل نہ پائی ابھی

ڈس گئے میرے اپنے مجھے
سانپ تھے آستیں کے سبھی

محو ہوں اپنی ہی ذات میں
مل ہی جاؤں گا خود سے کبھی

رائیگاں جانے کا دکھ ہے کیا؟
کاش! تم جان پاتے کبھی

محمد آفتاب تابش

حرکت بھی اپنی اصل میں آرام ہی نہ ہو
ہم کر رہے ہیں جو وہ کوئی کام ہی نہ ہو

دل نے بنا ہی لی ہے بالآخر کسی طرح
اک کائنات؛ جس میں کبھی شام ہی نہ ہو

رہنا ہے میرے دل میں تو خاموش ہو کے رہ
ممکن ہے یہ زمین ترے نام ہی نہ ہو

وہ رمز خوب کیا جو کسی پر نہ کھل سکے
وہ چیز خاص کیا جو کبھی عام ہی نہ ہو

اچھے برے کی بحث تو آگے کی بات ہے
لیکن اگر کہانی کا انجام ہی نہ ہو

ہم رک گئے ہیں جس کی مسافت کے خوف سے
سچ مچ وہ فاصلہ کہیں دو گام ہی نہ ہو

آتش فشاں سے کم نہیں آب و ہوا میں دل
دھڑکن جسے سمجھتے ہیں، کہرام ہی نہ ہو

جس طرز کا بھی چاہیے مطلب، نکالیے
وہ شعر ہی نہیں جہاں ابہام ہی نہ ہو

حمزہ یعقوب

# غزل

''جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے''
بس داستان رہ گئی ، کردار مر گئے

اُن سب کے میرے سینے پہ کتبے لگائیے
اظہار کے بغیر جو افکار مر گئے

اُن کے بغیر جی کے بھلا کیا کریں گے ہم
ہم کو بھی مار دینا اگر یار مر گئے

کوئی بھی میرے حق میں نہیں بولتا یہاں
یُوں چُپ ہیں جیسے میرے طرفدار مر گئے

دونوں کا جینا مرنا تھا اک دوسرے کے ساتھ
قدغن لگی جو فن پہ تو فنکار مر گئے

لازم ہے اُن کا نوحہ پڑھے دوپہر کی دھوپ
جو لوگ زیرِ سایۂ دیوار مر گئے

مرگِ محبت اصل میں تھی مرگِ کائنات
میرے لیے تو ثابت و سیّار مر گئے

نعمان! سب کی جان تھا وہ جانِ رنگ و بُو
اک پھول کیا مرا کہ سبھی خار مر گئے

نعمان محمود

# غزلیں

بجھ گیا دل جوانی ختم ہوئی
تیری میری کہانی ختم ہوئی
آخرِ کار زخم بول پڑے
درد کی بے زبانی ختم ہوئی
غم نے گھر کر لیا مرے دل میں
رنج کی لامکانی ختم ہوئی
ایک امید تھی مرے دل کو
آپ کی مہربانی، ختم ہوئی
موت سے مل گیا سکون مجھے
روز کی رائیگانی ختم ہوئی
آپ کے بعد دل بھی ڈوب گیا
آخری تھی نشانی ختم ہوئی
ہوگیا ختم درد کا موسم
صاحبو! زندگانی ختم ہوئی
سر سے اُترا جنونِ عشق سلیم
آفتِ ناگہانی ختم ہوئی

## سلیم تورانیہ

وحشتِ شب سے ڈر گیا میں بھی
شام ڈھلتے ہی گھر گیا میں بھی
ہم تو دونوں ہی بے وفا نکلے
تو بھی دل سے اُتر گیا، میں بھی
وقتِ رُخصت خزاں کا موسم تھا
پھُول بِکھرے، بِکھر گیا میں بھی
زہر کھانے کی بات کی اُس نے
اس کی باتوں سے ڈر گیا میں بھی
دفعتاً اس نے پھیر لی آنکھیں
صاف منہ پر مکُر گیا میں بھی
تم سے رشتہ ہی جسم و جاں کا تھا
مر گئے تم تو مر گیا میں بھی
زندگی نے کچھ ایسے زخم دیئے
دِل تو دِل ہے سُدھر گیا میں بھی
بعد از عشق سوچتا ہوں سلیم
وہ کہاں ہے کدھر گیا میں بھی

# غزلیں

وفاؤں کے تماشے کی اذیت مار دیتی ہے
کہیں مجنوں کو لیلیٰ کی یہ چاہت مار دیتی ہے

کہیں تم لوح پر اس قیس کے مصرعے کو لکھ ڈالو!
محبت سے رہو عاری محبت مار دیتی ہے

کہیں دستار سے پھندا لگا کے مر گیا کوئی
بزرگوں کی لڑائی میں عقیدت مار دیتی ہے

گلے کا طوق بنتی جا رہی ہیں تلخ یادیں سب
منافق سے عقیدت کی ندامت مار دیتی ہے

ہے بہتر زین رہنا تم غلامی کے احاطے سے
کسی کم ظرف قاضی کی قیادت مار دیتی ہے

عبدالرؤف زین

دیکھا پلٹ پلٹ کے کہ بیٹھی ہو پاس میں
رونق ترے ہی دم سے ہے ساری کلاس میں

یہ جینز جچ رہی ہے مگر ایک بات ہے
پیاری لگو گی مشرقی نیلے لباس میں

میری پہنچ سے دور بڑی دور ہو مگر
آ کر خرید لو نا مجھے سو پچاس میں

تو جو بنا حجاب کے کالج میں آئے گی
کیسے رہیں گے لوگ یہ ہوش و حواس میں

آنکھیں تری ہمیشہ پلاتی رہیں شراب
مے کون پیتا ایسے میں بھر کر گلاس میں

سردی کی شام کے یہ مناظر عجیب ہیں
لپٹا ہوا ہے آگ کا شعلہ کپاس میں

غلام جیلانی شمس

# غزل

وہ کہتا ہے مرے دل کا فقط اک تو سہارا ہے
میں کہتی ہوں سوا تیرے بتا کوئی ہمارا ہے

وہ کہتا ہے جدائی ہی فقط اپنا مقدر ہے
میں کہتی ہوں ملیں گے ہم ہمیں ملنا دوبارا ہے

وہ کہتا ہے سوا تیرے دکھائی کچھ نہیں دیتا
میں کہتی ہوں سبب تم ہو اگر دلکش نظارا ہے

وہ کہتا ہے کہ میرے ساتھ کیسے چل سکو گی تم
میں کہتی ہوں تمھارے ساتھ ہر اک دکھ گوارا ہے

وہ کہتا ہے محبت میں کبھی منزل نہیں ملتی
میں کہتی ہوں کہ ہر دریا کی قسمت میں کنارا ہے

وہ کہتا ہے کہ دل پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہو مجھ سے
میں کہتی ہوں تمھاری ہوں مرا دل بھی تمھارا ہے

وہ کہتا ہے کہ کیوں ہے آنکھ میں آنسو کا یہ قطرہ
میں کہتی ہوں تمھاری یاد کا روشن ستارا ہے

وہ کہتا ہے صدا کس کی مجھے بے چین کرتی ہے
میں کہتی ہوں چلے آؤ مرے دل نے پکارا ہے

نادیہ سحر

# غزلیں

جو بھولتا ہی نہیں ہے کبھی بھلانے سے
کوئی تو بات ہے اس میں الگ زمانے سے

اداس دل میں کئی پھول کھلکھلانے لگے
ہنسا ہے آئنہ بھی اس کے مسکرانے سے

ضرور ہوگا چلیں مل کے ڈھونڈ لاتے ہیں
ہمارے نام کا پل وقت کے خزانے سے

انا کے ناگ کے پھن کو کچلنا ہوتا ہے
مٹا بھی سکتے ہیں ہم تلخیاں مٹانے سے

دھواں کچھ ایسے جما ڈبڈبائی آنکھوں میں
اندھیرے بڑھتے ہی جاتے ہیں گھر جلانے سے

اڑان پہلی ابھی بھرنی تھی پرندے نے
گرا دیا ہے ہواؤں نے آشیانے سے

نگاہ رکھتا نہیں ہے کسی تجوری پر
جیا امیر ہوئی ہے جسے کمانے سے

## جیا قریشی

جو موجِ بغاوت بھی ہو تحلیل کروں گی
میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گی

معصوم بہت تھی سو ہمیشہ یہی سوچا
خوشبو سے میں حالات کو تبدیل کروں گی

پہچان گنوا بیٹھوں گی سوچا ہی نہیں تھا
چاہا تھا ادھورا ہے، میں تکمیل کروں گی

چوموں گی محبت سے سدا تیشہ ہنر کا
پتھر سے گلابوں کی جو تشکیل کروں گی

ابلاغ کا ہر رنگ مکمل ہو سخن پر
خوشبو کی طرح لفظ سے ترسیل کروں گی

ترتیب الٹ جائے گی ساری مرے گھر کی
اک روز اگر ہفتے میں تعطیل کروں گی

اس آس پہ تم لطف کا اک زاویہ کھینچو
تا دیر بیاں اس کی میں تفصیل کروں گی

تم جیسے بھی توضیح کرو اپنی خطا کی
پیش اپنے ہی انداز میں تاویل کروں گی

شبنم گلِ تازہ پہ اثر کرتی ہے جیسے
اس دل پہ جیا ایسے میں تنزیل کروں گی

# غزل

سنورنے کا ، نکلنے کا ، گزرنے کا، سنبھلنے کا
کہ آؤ وقت ہے آیا ، ہوا کے رخ بدلنے کا

محبت آگ ہے ٹھنڈی، سلگنا، اچھا لگتا ہے
مزہ سا آ رہا ہے میرے دل کو، آج جلنے کا

ہوا میں بے رخی ہے اور ہر سو نم ہوائیں ہیں
گل خوش رنگ! موقع ہے کسی دل کے مچلنے کا

یہ آنکھیں تھک چکی ہیں، دیکھ کر سارے نظارے ہی
نہیں ہے کوئی منظر بھی، نیا لیکن اجلنے کا

خرابے سے نکلنے کی کوئی تدبیر ہو مولا!
کہ گل کو چاہیے، کوئی بہانہ گھر بدلنے کا

کوکی گل

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ خالد
بے نیاز آسماں کے رنگ میں تھا

# غزل

عاشقی بے خبر ہوتی ہے
ہر کسی کی نظر ہوتی ہے

جان کی جو بچا جان لے
یہ وفا خوب تر ہوتی ہے

زندگی ہے خجالت نری
نوکری میں بسر ہوتی ہے

جانے مِل کا یہ مالک بھی کیا
مفلسی دردِ سر ہوتی ہے

حق رعایا کو دو ووٹ کا
پر حکومت کدھر ہوتی ہے

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ پہ ترے غم کا سائبان رہا ہے
دشت میں بھی سر پہ آسمان رہا ہے

# غزل

غبار زیست کو تجسیم کر لیا میں نے
کہ خود کو لائقِ تفہیم کر لیا میں نے

جو ایک عمر سے جاری تھا چشمِ حیرت سے
اس آبِ تلخ کو تسنیم کر لیا میں نے

تمام عمر کوئی بانٹنے نہ آیا تو
دکھوں کو خود پہ ہی تقسیم کر لیا میں نے

کسی کا حسنِ تغافل پسند آنے پر
کسی کے ہجر کو تسلیم کر لیا میں نے

محمد علی ایاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ میں نہیں، مرا پَرتَو نہیں، یہ میں تو نہیں
گماں سا کیوں مجھے گزرا؟ کہیں یہ میں تو نہیں

# غزل

جھیل کے ساحل پہ رقصاں ہر پری کی خیر ہو
ساتویں سیڑھی پہ ٹھہری چاندنی کی خیر ہو

آگ پر رکھی عداوت سرمئی ہونے کے بیچ
پیار کے دریا میں ڈوبی اُس گھڑی کی خیر ہو

دل لچکتی شاخ سے اُترا تو خواہش نے کہا
دست بستہ التجائی چاشنی کی خیر ہو

تپتا سورج ڈھل گیا جب شام کی آغوش میں
رات پھیلی اور کہا کہ روشنی کی خیر ہو

موت کے بے رنگ ہوتے ذائقے کے کھوج میں
دربدر الجھی ہوئی اِس زندگی کی خیر ہو

کون دیکھے گا ترا دھرتی پہ ہونے کا نشاں
آسمانوں سے اترتی شاعری کی خیر

زاہد خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ نقش ایک محبت کے عکس تھے خالد
وہ رنگ اب تری تصویر سے نکال دیے

# غزلیں

نہیں ہے شئے نہ ضمنِ شئے میں آئے
کوئی کیسے اسے پہچان پائے

جو دیکھے وہ ورائے دید دیکھے
دلوں کی آنکھ دیکھے اور دکھائے

پئے عرفاں نہیں قابل بیاں جو
اسے کیوں کر کوئی لفظوں میں لائے

نظر بازوں کے جملہ زاویوں سے
حقیقت ہر قدم آگے بڑھائے

رسائی بھی اسد ہے نارسائی
ورائے سمت رستہ کٹتا جائے

غلام شبیر اسد

خوشی کا استعارہ ڈھونڈ لاؤ
اسے سارے کا سارا ڈھونڈ لاؤ

پلٹ آئے وہ جس سے میری جانب
کوئی ایسا اشارہ ڈھونڈ لاؤ

میں اک بحرِ محبت ہوں خدارا
ذرا میرا کنارہ ڈھونڈ لاؤ

یہ کس نے پیار سے آواز دی ہے
مجھے کس نے پکارا ڈھونڈ لاؤ

نظر آئے مرا محبوب جس میں
وہ دلکش سا نظارہ ڈھونڈ لاؤ

ترستی ہیں یہ آنکھیں دیکھنے کو
اسے جاؤ دوبارہ ڈھونڈ لاؤ

لکھا ہے جس پہ میرا نام ناشط
وہ اک روشن ستارا ڈھونڈ لاؤ

ناشط مقبول

# ''گوریلی''

پندرہ سال امریکہ میں قید تنہائی کاٹنے کے بعد نیلم لاہو آ گئی ہے اور امریکہ کی قیدِ تنہائی کا انتقام لاہور سے لے رہی ہے۔ یہ تو وہی بات ہے کہ گری گدھے سے اور غصہ کمہار پر۔

صاحبو مہذب ہونے کے باوجود، تمدن اور ترقی کے باوجو جس کے ہم داعی ہیں اپنی چٹی قمیض اور سٹف کالر کے باوجود آج بھی ہم گرتے گدھے سے ہیں اور غصہ کمہار پر نکال کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔

ماں اپنے میاں کا غصہ بچوں پر نکالتی ہے۔ بابو، صاحب کا غصہ بیوی پر نکالتا ہے اور ساس اپنی جوانی کا غصہ بہو پر نکالتی ہے۔

نیلم کے انتقام کے کوائف اگرچہ دیکھنے میں انوکھے لگتے ہیں لیکن وہ انوکھے نہیں ہیں۔ سیدھے اور صاف ہیں، معصوم ہیں۔

وہ اپنی صلاحیتوں کے پٹارے کھولے بیٹھی ہے۔ وہ صلاحیتیں جن کے اظہار کا اُسے موقع نہ دیا گیا تھا، مہلت نہ دی گئی۔ بدقسمتی سے ان صلاحیتوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی تھی جن کی نمائش سے وہ محروم کر دی گئی تھی۔

باری باری انھیں بند گرد آلود پٹاروں سے نکالتی ہے، جھاڑتی ہے، پونچھتی ہے، چمکاتی ہے۔

پندرہ سال نیلم خود کو دکھانے کی فطری اور معصوم لذت سے محروم رہی۔ اس پر خوف طاری ہے کہ یہ محرومی المیہ نہ بن جائے۔ اس لیے وہ بنتی ہے سنورتی ہے، ہر حربہ آزماتی ہے کہ وہ دکھے۔

وہ بھولی بسری پکے راگ کی بندشوں کو پھر سے تازہ کر رہی ہے، ٹھمریوں کے بھولے ہوئے بول یاد کر رہی ہے۔ کتابوں کو شیلفوں میں سجا رہی ہے۔ دھڑا دھڑ افسانے لکھ رہی ہے۔ ابھی قید تنہائی میں سے نکلے ہوئے اسے تھوڑا عرصہ ہی ہوا ہے لیکن وہ اتنے ڈھیر سارے افسانے لکھ چکی ہے کہ اب ان کا مجموعہ چھپوانے کا اہتمام کر رہی ہے۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے کہ ناموافق حالات کے تحت مرد بجھ جاتا ہے، عورت بجھتی نہیں، راکھ بن جاتی ہے۔ موافق ہوا کا جھونکا آئے تو راکھ اڑ جاتی ہے اور دبا ہوا انگارہ باہر نکل آتا ہے۔

لیکن جب تک قیدِ تنہائی کی وضاحت نہیں ہو گی بات آپ تک نہیں پہنچے گی۔ قید تنہائی ایک رسم زدہ لفظ ہے۔ رسم زدہ ہو جائے تو مفہوم کی خوشبو اڑ جاتی ہے۔ صرف ڈھانچہ باقی رہ جاتا ہے۔ جبھی ہمارے تنقیدی مضامین میں ڈھانچے ہی ڈھانچے ہوتے ہیں۔ صرف فریم، خالی فریم۔

پندرہ سال نیلم شہروں سے دور، امریکہ کے دیہات کے ایک فلیٹی پنجرے میں قید رہی۔ یہ پنجرہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے کنارے پر ٹنگا ہوا تھا۔ گاؤں پر ہر وقت ایسا سناٹا طاری رہتا تھا جیسے قبرستان ہو۔ کبھی کبھی بوڑھوں کے کھانسوں کھانسوں کی آواز سنائی دیتی جو اس سناٹے کو اور بھی بھیانک کر دیتی۔

امریکہ کے دیہات کے نوجوان تلاش معاش اور شغل میلے کے لیے شہروں میں جا بستے ہیں۔ یوں دیہات اولڈ ہاؤس بن کر رہ جاتے ہیں۔ بوڑھوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا کہ کیسے ہو، کیا کر رہے ہو، کوئی اُمید نہیں ہوتی، کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ نہ رُخ نہ سمت جیسے کھلے پانیوں میں ٹوٹی

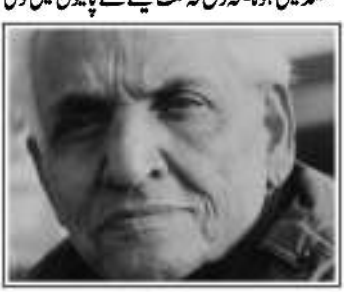

ممتاز مفتی

ہوئی کشتیاں ڈول رہی ہوں۔ وہ یوں وقت گزارتے ہیں جیسے پلیٹ فارم پر بیٹھے انتظار کر رہے ہوں کہ کب گاڑی آئے اور وہ رخصت ہو جائیں۔

امریکی بوڑھے ڈال سے ٹوٹے ہوئے پھل کی طرح ہوتے ہیں جو ایک ہی جگہ پڑا پڑا گل سڑ جاتا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہ ہو تو انسان گوشت کا لوتھڑا بن کر رہ جاتا ہے۔

وہ ایک بار نیلم اپنے میاں کے ساتھ گاؤں میں گئی تھی لیکن وہاں کا منظر دیکھ کر سہم گئی۔

بوڑھے کھڑکیوں سے حسرت زدہ اور ناامید نگاہوں سے جھانک رہے تھے، بستر پر لیٹے کھاؤں کھاؤں کر رہے تھے۔ کرسیوں پر بیٹھے خلا کو گھور رہے تھے۔ کسی کا سر روئی کے گالے کی طرح ہل رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ کانپ رہے تھے، کسی کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔

صاحب! ہم امریکی بوڑھوں کا تصور نہیں کر سکتے۔

ہمارے ہاں کا بوڑھا، بڑا بوڑھا ہوتا ہے، گھر کا سردار ہوتا ہے، گاؤں کا پنچ ہوتا ہے حکم چلاتا ہے، فیصلے دیتا ہے۔

نیلم کا خاوند کمیونٹی نرسنگ ہوم کا ڈاکٹر تھا جو سارا دن ڈیوٹی پر رہتا تھا۔

پندرہ سال پہلے جب نیلم یونیورسٹی میں فائنل ایئر میں تھی تب اس کے ذہن میں ہر لنگک فارورڈ لڑکی کی طرح بڑے بڑے پروگرام تھے۔ صرف فائنل امتحان کا انتظار تھا۔ اس کے دل میں اتنے سارے شوق یوں بھی بھن کر رہے تھے جیسے بھڑوں کا چھتہ ہو۔

موسیقی سیکھنے کا شوق تھا۔ ڈرامہ کھیلنے کی دھن تھی پینٹنگ کرنے کا ذوق تھا۔ ادب پر تو وہ جان چھڑکتی تھی۔

دراصل یہ تمام بیماریاں اسے ورثے میں ملی تھیں۔

پھر ایک دن جب نیلم جاگتے کے خواب دیکھ رہی تھی اس کے والد احمد بشیر نے گھر میں ایک دھماکہ کر دیا کہنے لگا۔ "بیٹی، میں نے ایک صاف ستھرے نیک دل ڈاکٹر کا رشتہ تیرے لیے منظور کر لیا ہے جو امریکہ میں ملازم ہے، پرسوں تیری شادی ہو جائے گی اور اس کے تیسرے دن بعد تو اپنے ماں کے ساتھ امریکہ چلی جائے گی۔"

احمد بشیر ایسے دھماکے کرنے کا عادی ہے اس نے اپنی چاروں بیٹیوں کی دھماکہ شادی کی ہیں۔ اس کی اپنی شادی بھی دھماکہ شادی تھی۔

اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی پر اس نے مجھے خط لکھا "پیارے ممتاز" میں نے ہومی کی شادی کر دی ہے۔ شادی پر کل چار سو پچاس روپے خرچ ہوئے ہیں اور ہم نے جہیز لینے سے انکار کر دیا ہے۔ کیوں کیسا؟"

ایسے کاموں پر احمد بشیر خواہ مخواہ کریڈٹ طلب کرتا ہے۔ درحقیقت سارا کریڈٹ اس کی بیوی سودی کو جاتا ہے اگر میں ایسی حرکت کرتا تو میری بیوی مجھے گھر سے نکال دیتی۔

نیلم کی زندگی میں یوں بیٹھے بٹھائے آناً فاناً نیچے اوپر دو حادثے ایک شادی، دوسرا امریکہ عمل میں آئے تو وہ بوکھلا گئی۔ ہم سمجھے کہ یہ بوکھلاہٹ امریکہ جانے کی خوشی کی غماز ہے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ جس امریکہ وہ جا رہی ہے وہ ایک فینٹسی پنجرہ ہے جو ایک قبرستانی گاؤں کے کنارے لٹکا ہوا ہے۔

جس گھر میں نیلم پیدا ہوئی اور پروان چڑھی وہ ایک چوں چوں کا مربہ گھر تھا۔ گھر میں کتابیں تھیں، ستار تھی، کتھک اور کتھاکلی کے انگ تھے۔ ادیبوں، دانشوروں اور فن کاروں کی بیٹھکیں جمتی تھیں۔ سبھی کچھ تھا مگر کھانے کو روٹی نہ تھی۔

احمد بشیر نے سارے پاپڑ بیل دیکھے۔ فلم ساز بنا، افسر بنا، صحافی بنا، گدھا گاڑی چلائی، کپڑا بیچا، شہرت پائی، نام بنا لیا لیکن گھر میں صرف دو دور ہی رہے۔ دال روٹی کا دور اور گوشت روٹی کا دور۔

گھر میں سات جی تھے۔ احمد بشیر، اس کی بیوی سودی چار بیٹیاں، نیلم، بچو، گوپی، ماٹو اور ایک بیٹا ہومی لیکن روٹی کا فکر صرف سودی پر طاری رہتا تھا۔ نیلم بچو موسیقی سے دل بہلایا کرتیں۔ احمد بشیر بھوک کے فلسفے پر غور کرنے لگ جاتا۔ چھوٹے بچے گلی میں کھیل کود کر وقت گزار لیا کرتے۔ صرف سودی ماہی بے آب کی طرح سارے گھر

میں گھومتی پھرتی۔ "ہائے اب میں کیا کروں۔"

سارا قصور احمد بشیر کی جینز Genes کا ہے۔ اس کی جینز میں تین بنیادی عناصر نمایاں ہیں۔ قابلیت، ایڈونچر اور دیوانگی۔ لڑکیوں نے یہ تینوں خصوصیات ورثے میں پائی ہیں۔

نیلم میں قابلیت کا عنصر کچھ زیادہ ہی تیز تھا۔

نیلم نے مجھے لکھا۔ بابا میں کہانیاں لکھ رہی ہوں کیا کروں۔ میں نے جواب دیا۔

"ٹیلی کہانیاں لکھ نہیں کبھ۔ قاری کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر کبھ، ٹھنڈی میٹھی نہ لکھ، پکوڑے تل، اچھے کرارے کہ لوگ سی سی کریں۔ ناک منہ سے پانی بہے، رال ٹپکے، کردار نظر آئیں، نہ آئیں مصنف چھائی رہے۔

نیلم نے کہا، بابا میں نے پکوڑے تلے لیکن تاثر چھاپتے نہیں۔

میں نے کہا۔ پیاری پکوڑے میں السطور ہوتے ہیں۔ لفظوں میں نہیں آتے۔ قاری سمجھے کہ رس گلا ہے لیکن کھاتے وقت سی سی کرے۔

صاحبو میری مشکل یہ ہے کہ میرے دوستوں کے بچے بھی میرے دوست بن جاتے ہیں۔ پھر کچھ ایسی صورت بن جاتی ہے کہ محتسب سے دوستی ساقی سے یارانہ رہے۔

دراصل احمد بشیر کا گھر ایک پاگل خانہ ہے۔ پروین عاطف کہتی ہے کہ یہ پاگل پنا میں ان کے گھر لایا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا پاگل پنا ان کی صحبت کا نتیجہ ہے۔

گورداسپور میں احمد بشیر کے ماموں اشفاق حسین کے گھر روز محفل موسیقی لگتی تھی۔ یہ 1944 کی بات ہے۔ میں وہاں طبلہ سیکھنے کے شوق میں گیا تھا آج تک گھر واپس نہیں آیا۔

اس گوریلا گروپ نے مجھے ایسا چھا مارا کہ نہ کہیں کا ہو رہا۔

دراصل یہ لوگ ایمن آباد کے شیخ ہیں جنہیں شیخ بن کر زندگی بسر کرنا منظور نہ تھا چونکہ ٹیلنٹڈ تھے، فنکار تھے، شیخ خاندان میں صرف ایک ٹیلنٹ کی عزت تھی۔ کاروبار، وہ آرٹ فار پرافٹ کے قائل تھے۔ آرٹ فار آرٹ سیک کو حماقت سمجھتے تھے لہٰذا یہ گوریلے بن گئے۔ اشفاق حسین اور احمد بشیر اوور گراؤنڈ رہے۔ پروین عاطف، نیلم اور سپو انڈر گراؤنڈ ہو گئیں۔ میرا دونوں سے رابطہ رہا ہے۔ اوور گراؤنڈ والے سمجھتے ہیں کہ میں ان کا ساتھی ہوں۔ انڈر گراؤنڈ والے سمجھتے ہیں کہ میں ان کا 007 ہوں۔

احمد بشیر کا گھر دھوپ چھاؤں کا امتزاج ہے۔ چھاؤں کو دیکھو تو بہت ٹھنڈی ہے لیکن دھوپ کڑاکے دار ہے۔ احمد بشیر نے بڑی فراخدلی سے اپنے گھر کو جمہوریت دے رکھی ہے لیکن گھر میں صرف احمد بشیر کی چلتی ہے۔ جو درپردہ بہت بڑا آمر اور ظاہر میں جمہوری، جمہور، پیار اس کا واحد ہتھیار ہے۔ جس کے زور پہ وہ گھر اور دوستوں کو اپنی مرضی پر چلاتا ہے، ہیٹس آف ٹو موومی۔

احمد بشیر نے ساری زندگی التزاماً گھر پہ غریبی طاری رکھی ہے۔ زیادہ آ جائے تو بانٹ دیتا ہے۔ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے کہ کہیں زیادہ آنے کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ صاحبو جان لو کہ نیلم ان حالات کے تحت پلی ہے۔

نیلم زندگی کے انوکھے مشاہدات سے گزر رہی ہے، اوچھے لوگوں کو قریب سے دیکھا ہے اندر باہر کا فرق سمجھا ہے۔ معصوم ہیرا بھیریوں کو جانا ہے۔ زندگی بھر اسے یہ خوف دامن گیر رہا کہ میں کبڑی نہ رہ جاؤں کیونکہ اسے علم تھا کہ بڑے اور گھنے درخت تلے اگنے والے بوٹے لازماً کبڑے رہ جاتے ہیں۔ اس کے دل میں احتجاج کی پھلجڑی پکتی رہی۔ نہیں میں قد آور بنوں گی۔ اس کی پھوپھی پروین عاطف جو خود گنوں کی گٹھڑی ہے جس نے کانٹوں میں الجھ کر زندگی بسر کرنا سیکھ رکھا ہے ان انڈر گراؤنڈ گوریلوں کی لیڈر ہے جسے نیلم کی صلاحیتوں کا شعور ہے۔

اب پندرہ سال بعد نیلم کو موقعہ ہاتھ آیا ہے اس کی خوابیدہ صلاحیتوں نے انگڑائی لی ہے اور اب وہ بڑی دیدہ دلیری سے گزرتے ہوئے ناسازگار حالات اور واقعات کا بدلہ لے رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ایک دن نیلم، احمد بشیر کے باوجود، ادب کے میدان میں قد آور مصنفہ بن کر ابھرے گی۔

☆☆☆☆☆

# شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورگورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

وزراء کرام: گوجرانوالہ بڑا ضلع ہے۔ اسی حساب سے وزرا کی ایک پوری کھیپ چنی گئی تھی۔ سب سے بڑے وزیر تو غلام دستگیر خان تھے۔ کشمیری ہونے کے ناطے میاں نواز شریف کے بہت قریب تھے۔ بڑے اکھڑ مزاج اور دبنگ قسم کے انسان تھے۔ شدید غصے کے عالم میں گالی گلوچ پر بھی اُتر آتے۔ ان سے میاں صاحبان پیار بھی کرتے تھے اور خم بھی کھاتے تھے۔ ایک الیکشن کے موقعہ پر گوجرانوالہ کی ساری برادریاں ان سے ناراض ہو گئیں۔ انصاری جاٹ، مغل اور شیخ صاحبان، چیمبر آف کامرس بھی ناخوش تھا۔ سب نے لاہور جا کر میاں نواز شریف سے درخواست کی کہ ان کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے اس لئے ٹکٹ ضائع نہ کیا جائے۔ بظاہر سیاسی ماحول

سازگار نہیں تھا۔ بڑے میاں صاحب نے شہباز شریف کی ڈیوٹی لگائی کہ اپنا آدمی ہے اسے بلا کر سمجھاؤ اور بٹھا دو۔ شہباز شریف نے مخالفین کی موجودگی میں بلا کر پارٹی کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ یہ سننا تھا کہ غلام دستگیر خان کا پارہ چڑھ گیا۔ نہایت غصے میں بولے ''آپ ہوتے کون ہیں مجھے مشورہ دینے والے۔ میں سیاسی آدمی ہوں، ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے۔ میرے ہارنے سے کون سا آسمان گر پڑے گا۔ آپ کی بزدلی نے تو مجھے ہارنے سے پہلے ہرا دیا ہے۔ میں الیکشن لڑوں گا چاہے مجھے ایک ووٹ بھی نہ ملے۔'' مخالفین ان کا دبکا نہ سہہ سکے اور تتر بتر ہو گئے۔ شہباز شریف بھی چپکے سے کھسک گیا۔ کمرہ خالی تھا لیکن خان صاحب ہنوز غصے کے عالم میں بولے جا رہے تھے۔ بالآخر پارٹی ٹکٹ انہیں مل گیا اور وہ جیت گئے۔

مجھ سے بڑی شفقت اور پیار سے ملتے۔ کبھی کوئی ناجائز کام نہ کہا۔ بس ایک بار ایک کشمیری لڑکے کی سفارش کی کہ اسے رجسٹری محرر لگا دیا جائے۔
کہنے لگے ''میں سفارش کرنا تو نہیں چاہتا تھا مگر برادری نے زچ کر دیا ہے۔'' وہ لڑکا ٹریفک مجسٹریٹ اسلم قاسمی کا اہلمد تھا۔ بڑا معمولی کام تھا میں نے اسے رجسٹری محرر مقرر کر دیا۔ اتفاق سے چند دن بعد ٹریفک کے چالان ایک وکیل کے چیمبر سے برآمد ہوئے۔ ابتدائی تفتیش پر قاسمی اور اہلمد دونوں قصوروار پائے گئے۔ میں نے اہلمد کو معطل کر دیا اور قاسمی کو بھی اس کے عہدے سے ہٹا کر سب کام واپس لے لیا۔

دوسرے دن غلام دستگیر خان کا فون آ گیا۔ گلہ کرتے ہوئے بولے ''شاہ صاحب! ہم تو نمازیں بخشوانے گئے تھے لیکن آپ نے تو روزے بھی ہمارے گلے ڈال دیئے ہیں۔'' جب میں نے انہیں اصل بات بتائی تو ایک دم بولے ''بالکل ٹھیک کیا ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ بدبخت خائن ہے۔'' اس کے چند روز بعد دوسرے وفاقی وزیر حامد ناصر چٹھہ صاحب کا فون آ گیا۔ وہ اسلم قاسمی کی بحالی چاہتے تھے۔
کہنے لگے ''میں ذاتی طور پر تو اسے نہیں جانتا لیکن وہ میرے ہم زلف کا کلاس فیلو ہے۔ ہم زلف ہسپتال میں ہے اور اس نے خصوصی پیغام بھیجا ہے۔ آپ یہ کام ضرور کر دیں۔''
میں نے غلام دستگیر خان کی طرح انہیں بھی بتایا کہ بات ساری ضلع کچہری میں پھیل چکی ہے۔ اہلکار کو معطل کر کے افسر کے خلاف ایکشن نہ لینا زیادتی ہوگی۔ وہ بار بار تقاضا کرتے رہے اور میں ہر بار معذرت کرتا رہا۔ آخر میں زچ ہو کر بولے ''ڈی سی صاحب! یہ کام تو آپ کو کرنا ہی ہوگا۔ میں اپنے ہم زلف کو کس منہ سے لکا سا جواب دوں۔''
ان کے دھمکی آمیز لہجے کی قطعیت کو دیکھتے ہوئے مجھے بھی غیر مبہم الفاظ میں بات کرنا پڑی۔ **I am sorry Chatha sahib. I will not do it.** اور فون بند کر دیا۔ اس کے بعد میری ان سے کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ ویسے بنیادی طور پر وہ شریف انسان تھے اور مسٹر کلین کہلاتے تھے۔ انتظامیہ سے بھی کم ہی ملتے۔ میں جب

آیا تو انہیں ملنے اُن کے گاؤں علی پور چٹھہ گیا۔ گھر کی سادگی مجھے پسند آئی۔ صاف گو انسان تھے۔ گو نواز شریف کی کابینہ میں تھے لیکن ان میں واضح کھچاؤ تھا۔ ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ پنڈی سے فون آ گیا۔ جنرل آصف نواز فوت ہو گیا تھا۔ کہنے لگے ”مجھے ابھی پنڈی جانا ہو گا۔ جنازے میں شرکت ضروری ہے۔ نواز شریف خوش قسمت ہے اس دفعہ بھی بچ گیا۔ اگر یہ شخص کچھ دن اور زندہ رہ جاتا تو میاں صاحب کی رخصتی یقینی تھی۔“ ان کی باتیں سن کر کچھ یوں گمان ہوا جیسے انہیں دہرا افسوس ہوا ہے۔ آصف نواز کے گزر جانے کا......اور نواز شریف کے بچ جانے کا!

رانا نذیر منسٹر آف اسٹیٹ تھا۔ یہ میاں نواز شریف کا نفسِ ناطقہ تھا۔ انہیں سارے ضلع کی سن گن دیتا تھا۔ صاحبانِ اقتدار کو ہر جگہ ایک Focal Person رکھنا پڑتا ہے۔ اکثر لوگ طنزاً کہتے ہیں کہ فلاں شخص کلرک تھا اب وزیر ہو گیا ہے۔ ہر کلرک وزیر نہیں بنتا اس کے لئے غیر معمولی ذہانت، چالاکی اور ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح کے کچھ لوگ اپنے ماضی کو دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں کچھ ایاز کی طرح اسے سنبھال کر رکھتے ہیں۔ رانا صاحب کا کاموں کی میں محل نما مکان تھا۔ مہمان نواز تھے، ہر وقت لوگوں کی آمد و رفت رہتی۔ پارٹی کا انتخابی نشان شیر تھا اس لئے ایک زندہ شیر بھی پال رکھا تھا۔ بڑے سے پنجرے میں بند شیر ہر نو وارد کو دیکھ کر دھاڑتا تھا، اس سے مہمان کے دل میں ایک دہشت طاری ہو جاتی۔ رانا صاحب بھی کھلے ڈلے آدمی تھے۔ اپنی مرحلہ وار ترقی اور مدارج کا ذکر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بیان کرتے۔ پہلی ملاقات میں ہی کہنے لگے ”ایک چیز کی وضاحت کرنی ہے اور اقبالِ جرم بھی کرنا ہے، سزاوار اس لئے نہیں ٹھہر سکتا کہ آپ سے پہلے واقفیت نہیں تھی۔ آپ کا تبادلہ میں نے رُکوانے کی کوشش کی۔ میں ممتاز جوئیے کو لانا چاہتا تھا۔ وائیں مانتا نہیں تھا۔ نواز شریف کو میں نے ہی کہا تھا کہ کچھ دن کے لئے تبادلہ رکوا دے، میں وائیں کی آخری منت کر دیکھتا ہوں۔ بڑا ضدی شخص ہے اڑ جائے تو نواز شریف کی بات بھی نہیں مانتا۔“

میں نے رانا صاحب کی بات کا تو برا نہ منایا البتہ میاں صاحب کے طرزِ عمل پر افسوس ہوا۔ انہیں ملتان میں میری اتنی ضرورت نہ تھی جتنا رانا نذیر کو جوئیہ لانے کی خواہش تھی۔ مجھے فوری احساس ہوا کہ یہ وہ نواز شریف نہیں ہے جو پنجاب کا وزیرِ اعلیٰ تھا۔ یہ وزیرِ اعظم پاکستان ہے جو سعید مہدیوں اور سیف الرحمانوں کے نرغے میں ہے اور جس کی سوچ کے قافلے اب دوسری راہوں پر گامزن ہیں۔

ملک اقبال ایس ایس پی: گوجرانوالہ میں ملک اقبال ایس ایس پی تھا۔ مرزا محمد علی کی طرح ملک صاحب سے بھی مکمل ہم آہنگی تھی۔ ملک نہایت زیرک، بردبار اور ٹھنڈے مزاج کا شخص ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک پروفیشنل افسر ہے اس لئے فرائض کی ادائیگی کے ضمن میں اکثر ہائی کورٹ کے چکر کاٹنا پڑتے۔ اس کی وجہ سے دو دفعہ مجھے بھی جانا پڑا۔ پہلی مرتبہ خلیل رندے صاحب کی عدالت میں پیشی

ہوئی۔ تو ہین عدالت کا کیس تھا۔ پولیس نے ان کے کسی حکم کی تعمیل نہ کی تھی۔ جب ہم دونوں عدالت میں پیش ہوئے تو مجھے دیکھ کر بولے "شاہ صاحب! آپ کیسے آئے ہیں۔ میں نے تو صرف ایس ایس پی کو بلایا ہے۔"

میں نے کہا "ہائی کورٹ سے حکم نامہ گیا اور میں حاضر ہو گیا ہوں۔"

بولے "یقیناً غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے۔ آپ بیٹھیں۔"

میں نے کہا "جناب والا! میرا ایس ایس پی کھڑا ہوا ہے، اچھا نہیں لگتا کہ میں بیٹھ جاؤں۔"

مسکراتے ہوئے بولے "اس ایک جملے نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا ہے۔ اسے بھی ساتھ لے جائیں۔"

دوسری مرتبہ جسٹس لون صاحب کی عدالت میں پیشی ہوئی۔ انہوں نے مجھے نہیں بلایا تھا۔ ملک کے اصرار پر میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ بھی سخت غصے میں تھے۔ رانا وکیل خان کے بیٹے رانا شمشاد کو ٹکٹ مل گیا تو انہوں نے وائس صاحب کا جلسہ جی ٹی روڈ پر کرا دیا۔ لاہور سے پنڈی جانے والی سڑک بلاک ہو گئی۔ جسٹس لون اتفاقاً لاہور سے پنڈی جا رہے تھے۔ جب تھانیدار نے انہیں روک کر گاڑی کو براستہ شیخوپورہ جانے کے لئے کہا تو وہ بڑے حیران ہوئے۔ ڈرائیور کے سمجھانے پر بھی وہ نہ سمجھا۔ یہ پرانے پولیس اہلکار بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ملتان میں ایک نے جرنیل کو روک دیا اور دوسرا کامونکی میں جج سے گستاخی کر بیٹھا۔ بڑی مشکل سے ملک کو معافی دلوائی۔ جاتے جاتے جج صاحب نے ملک اقبال سے ایک سوال پوچھ لیا۔

بولے "ایس ایس پی مجھے ایک بات بتاؤ۔ اگر تمہاری پولیس کا سپریم کورٹ کے جج کے ساتھ یہ رویہ ہے تو پھر عام پبلک کا تو خدا ہی حافظ ہے۔" ملک بھی بڑا کائیاں تھا۔ بس ایک جملہ ہی دہراتا رہا۔ Your Lordship, I tender an unqualified apology, I tender an unqualified apology. اگر جج صاحب اس پر بھی مطمئن نہ ہوتے تو ملک کو دوسرا جملہ بھی ازبر تھا I throw myself at the mercy of this honourable court. لارڈ میکالے نے جہاں اہل ہند کو قانون دیا تھا وہاں اس کی زد سے بچنے کے طور طریقے بھی سکھا دیئے تھے۔

گوجرانوالہ میں مشاعرہ: اگر آدمی روایات کا غلام نہ بھی ہو تو احباب بنا دیتے ہیں۔ شاعر دوستوں کے تقاضے بڑھتے گئے کہ حسب سابق گوجرانوالہ میں مشاعرہ ہونا چاہئے۔ اپنے افسروں سے بات کی تو وہ بڑے حیران ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ جیسا دیس ہو ویسا بھیس بدلنا چاہئے۔ یہ پہلوانوں کا شہر ہے یہاں دنگل اور کشتیاں تو ہو سکتی ہیں مشاعرہ نہیں ہوتا۔ انہیں سمجھایا کہ مشاعرہ بھی ایک قسم کی ذہنی ورزش ہے۔ ایک شاعر کو جو زور غزل میں مارنا پڑتا ہے اتنی مشقت پہلوان نہیں کر سکتا۔ بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود میر کا انداز نصیب نہیں ہوتا۔ اُستاد ذوق نے تو اس کا برملا اعتراف کر لیا تھا لیکن یہاں افتخار عارف جیسے شاعر بھی ہیں جو یہ کہنے کی جسارت بلکہ گستاخی کر بیٹھتے ہیں کہ میر تو میر ہم غالب بھی نہ ہوئے۔ اس میں

شاید ان کا اتنا قصور بھی نہ ہو۔ پرویز مشرف نے اکادمی ادبیات کا چیئرمین مقرر کر کے ان کی خوراک کا خاطر خواہ بندوبست کر دیا تھا۔ جب پیٹ میں ضرورت سے زیادہ خوراک چلی جائے تو پھر اسے ہضم کرنے کا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ خمار گندم تو مشہور ہے اس سے اکثر دماغ متاثر ہو جاتا ہے۔

جب ارادہ کر لیا تو پتہ چلا کہ اکرم ذکی جیسے لوگ بھی اسی شہر کے باسی ہیں جو ہیں تو فارن سروس میں لیکن ان کا شعری ذوق کسی سے کم نہیں ہے۔ وہ اس وقت فارن سیکرٹری تھے۔ صدارت کی دعوت دی تو خوش ہو کر قبول کر لی۔

مشاعرے کا اہتمام ''مجلس تقریبات ملی'' نے کیا۔ میں اس کا تاحیات صدر تھا اور طاہر تونسوی صاحب سیکرٹری جنرل تھے۔ عالمی اُردو کانفرنس کا اہتمام بھی اسی نے کیا تھا۔ مجھے ملتان میں ایک بات کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا اور اسے دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ ہمارے ہاں شاعروں اور ادیبوں میں مکمل گروہ بندی ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اصغر ندیم سید کو تو نسوی صاحب نے عمداً نظر انداز کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک میں سب ادیبوں اور شاعروں کو نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے بڑا شور مچایا بلکہ دھمکی دی کہ ملتان آ کر وہ باقاعدہ احتجاج کریں گے اور ایک پریس کانفرنس سے خطاب فرمائیں گے۔ طاہر تونسوی نے مجھے بتائے بغیر انہیں ڈرایا کہ ڈی سی محترم کو ''سیدھا'' کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور بھی بہت کچھ کہا۔ نتیجتاً وہ نہ آئے بلکہ مجھے ایک معذرت خواہانہ خط لکھا۔ مجھے بڑا افسوس ہوا اور میں نے طاہر تونسوی کی سرزنش کی۔ طاہر تونسوی ویسے تو مستند ادیب ہے۔ تونسہ شریف نے دو ہی ادیب پیدا کیے ہیں۔ فکر تونسوی اور طاہر تونسوی۔ فکر تو ہندوستان کے مانے ہوئے مزاح نگار تھے۔ ڈاکٹر طاہر اپنی حرکات وسکنات سے ہی بسا اوقات مزاح کا پہلو پیدا کر دیتا ہے۔ ایک تقریب میں ریاض قلیانہ وزیر تعلیم مہمان خصوصی تھے۔ طاہر تونسوی سٹیج سیکرٹری انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے بولے ''ہمیں بڑی مسرت ہوئی ہے کہ آج ہمارے درمیان رضیہ قلیانہ موجود ہیں۔ یہ زبان کی بہت بڑی لغزش تھی لیکن قلیانہ صاحب نے بالکل محسوس نہ کیا۔ جب ان کی باری آئی تو کہنے لگے ''گرمی بہت پڑ رہی ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں بھی جلدی میں انہیں طاہرہ تونسوی کہنے والا تھا۔'' جب سامعین نے بے ساختہ تالیاں بجائیں تو ڈاکٹر صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

وہ شعرا کی الگ سے فہرست لے کر آئے تھے لیکن میں نے اُسے قبول نہ کیا اور صرف ان شاعروں کو دعوت دی جو عوامی سطح پر مقبول تھے۔ عالمی سطح پر تو مشاعرہ ممکن نہ تھا لیکن ہم نے سارے پاکستان سے چیدہ شعرا کو بلایا اور گوجرانوالہ میں ایک نئی روایت کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں مراد آئی ہسپتال کے بانی حاجی مراد صاحب نے بڑی مدد کی۔ حاجی صاحب کو اگر گوجرانوالہ کی شناخت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کارخانہ دار ہیں لیکن شہر کا کوئی ایسا رفاہی ادارہ نہیں ہے جس میں ان کا عمل دخل یا حصہ نہ ہو۔ ایک عام ورکر کی طرح فی سبیل اللہ کام کرتے ہیں۔ ڈویژنل پبلک سکول کا آڈیٹوریم انھوں نے ایک دوست کی وساطت سے مفت بنوا کر دیا۔ صبح سے لے کر شام تک وہاں کھڑے ہو کر کام

کرواتے۔ جس وارفتگی سے لوگوں نے صبح تک مشاعرہ سنا اس سے یقین ہو گیا کہ علم و ادب اور شعور و آگہی میں گوجرانوالہ کسی سے کم نہیں ہے۔

رائٹرز ویلفیئر فنڈ: پاکستان کا ادیب بے شمار معاشی مسائل سے دوچار ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا ادیب ہو جو محض اپنی کتابوں کے سہارے زندہ ہو۔ جو چند ایک اس قسم کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بھی دراصل ٹی وی اور اخباری کالموں کے ذریعے روزی کماتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کتابیں بہت مہنگی ہو گئی ہیں۔ وہ جو انہیں پڑھنا چاہتے ہیں ان کے پاس پیسہ نہیں ہے اور جو استطاعت رکھتے ہیں انہیں شوق نہیں ہے یہ چند گھٹیے مجرا اور گانا تو دیکھ اور سن سکتے ہیں لیکن کتاب کا عنوان پڑھ کر ہی سر درد شروع ہو جاتا ہے۔ مغرب میں کتاب hit ہو جائے تو لاکھوں کی تعداد میں بک جاتی ہے یہاں ایک ہزار کتاب بیچنے کے لئے پورا سال چاہئے۔ بکنے کی صورت میں سارا نفع پبلشر لے جاتا ہے مصنف کے حصے میں صرف محرومیاں آتی ہیں۔ کتاب بیچ کر بھی بہانے تراشتے رہتے ہیں اور حیلہ سازیوں سے کام لیتے ہیں۔

حکومت نے بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ احمد ندیم قاسمی جیسا عظیم ادیب گلہ کرتا رہا کہ ان کی تنخواہ ایک گریڈ ۱۷ کے افسر سے بھی کم ہے۔ میں ایک طویل عرصہ تک انہیں ٹانگے پر بیٹھے گھر سے آتے جاتے دیکھتا رہا۔ لاہور کی ایسی کوئی سڑک نہیں جس پر ڈھیلا ڈھالا کرتہ پاجامہ پہنے اور ہاتھ میں تھیلا لٹکائے قتیل شفائی نہ چلے ہوں۔ منٹو، مجاز اور جگر کے قصے زبان زد خاص و عام تھے۔ انہوں نے عدم کی طرح میکدے کے راہ سے ہو کر حیات کا طویل سفر تو نہ کاٹا بلکہ اس کی دہلیز پر ہی زندگی گزار دی۔

پرائیویٹ سیکٹر بھی اس سلسلے میں مجرمانہ غفلت کا شکار رہا۔ اس تناظر میں میں نے وائیں صاحب سے بات کی اور انہیں قائل کیا کہ حکومت ادیبوں کی فلاح کے لئے خطیر رقم مختص کرے۔ ایک کروڑ روپے کا ریوالونگ فنڈ سیکرٹری انفارمیشن کو دیا گیا جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جب بھی کوئی ادیب مالی مشکلات کا شکار ہو جائے تو اس کی بغیر کسی تشہیر کے مدد کی جائے نیز معیاری کتابیں بھی چھپوائی جائیں۔

میں نے اپنی سطح پر بھی رائٹرز ویلفیئر فنڈ قائم کیا۔ یہ ایک پرائیویٹ فنڈ تھا اور اس کا حکومتی گرانٹ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عالمی اُردو کانفرنس کے بعد میں نے ایک کتاب اُردو زبان مسائل اور امکانات کی تدوین کی تھی۔ وزیر اعلیٰ نے ڈائریکٹو جاری کر دیا کہ کتاب قومی اہمیت کی حامل ہے لہٰذا سکول کالجوں اور لوکل گورنمنٹ کے اداروں کی لائبریریوں کے لئے خریدی جائے۔ عثمان ابراہیم وزیر تعلیم تھے۔ ان کا تعلق بھی گوجرانوالہ سے تھا، انہوں نے خصوصی شفقت فرمائی۔ کتاب بکی تو فنڈ قائم کرنا آسان ہو گیا۔ اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا کہ لینے اور دینے والے ہاتھ کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

ادیب دنیا کے کسی کونے میں بھی ہو، بڑا حساس ہوتا ہے۔ وہ بھوکا تو رہ سکتا ہے، سر راہ دست طمع دراز نہیں کرتا۔

حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ مجھے اچانک گوجرانوالہ چھوڑنا پڑا۔ اس کا ذکر آگے چل کر

آئے گا۔ میرے بعد جو صاحب آئے انہوں نے کسی ادیب کو اس خطیر رقم کی ہوا تک بھی نہ لگنے دی۔ نہ جانے کتنا بڑا پیٹ ان کے جسم کے ساتھ لگا ہوا تھا، یہ وہی شخص تھا جسے میاں شہباز شریف نے صحافیوں کی موجودگی میں کہا تھا "میں تمہارے گلے میں پھندا ڈال کر گوجرانوالہ چوک میں اُلٹا لٹکاؤں گا۔" شہباز شریف کو خبر ملی تھی کہ اس نے سٹیڈیم کی تعمیر میں خورد برد کی تھی۔ اس شخص کو ادب اور ادیبوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ جب میں کئی سال بعد سیکرٹری انفارمیشن مقرر ہوا تو میں نے احمد ندیم قاسمی صاحب کی تنخواہ تین گنا بڑھا دی تھی۔ اس نے چارج لیا تو سب سے پہلا کام اس تنخواہ کو کم کر کے پہلی سطح پر لانے کا کیا۔ قاسمی صاحب نے مجھ سے گلہ کیا تو میں نے اس سے بات کی۔

کہنے لگا "اتنے بڑے ادیب اور شاعر کو تو بغیر تنخواہ کے کام کرنا چاہئے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ ہم نے ان کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ مجھے سیکرٹری اطلاعات بنے ایک ماہ ہو گیا ہے لیکن ابھی تک وہ دفتر میں سلام کرنے نہیں آئے۔"

لانگ مارچ: موزے تنگ نے لانگ مارچ کے ذریعے حکومت کا تختہ اُلٹ دیا تھا۔ ہمارے لیڈر اقتدار کی ہوس میں اس قسم کے نعرے تو ضرور لگاتے ہیں لیکن وہ جوش، جنوں اور جذبہ پیدا نہیں کر سکتے جو اس پُرخار راستے پر چلنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ کامیابی کے لئے اپنی ذات کے حصار سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ ان گنت قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور ہزار خار مغیلاں پر پاپیادہ چل کر آبلہ پا ہونا پڑتا ہے تب کہیں جا کر کامیابی کی کرن نظر آتی ہے۔ محض نعرے لگانے سے عقابی روح بیدار ہوتی ہے اور نہ منزل کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے قبلہ قاضی حسین احمد صاحب اس میں ملین کی اضافت کر کے اس عظیم کمیونسٹ لیڈر کے مردہ جسم کو اکثر گدگداتے رہتے ہیں۔ کسی زمانے میں اپنی ذات کو ہی دس لاکھ کے برابر سمجھتے تھے اس لئے ظالموں کو ڈراتے، دھمکاتے رہتے کہ قاضی آ رہا ہے۔ بعد میں جب دیکھا کہ دھمکی کارگر نہیں ہوئی کیونکہ ظالم باب نہ در ہے تو مین مارچ کا سہارا لے لیا۔ محترمہ بے نظیر اور میاں نواز شریف بھی اکثر اس قسم کی آنکھ مچولی کھیلتے رہتے تھے۔ یعنی جو اپوزیشن میں ہوگا وہ حکومت کی چیرہ دستیوں، ظلم اور زیادتیوں کے خلاف لانگ مارچ کرے گا اور صاحب اقتدار اس کو غیر جمہوری، غیر اسلامی اور غیر اخلاقی قرار دے کر روکنے کی کوشش کرے گا۔ چونکہ حکومت میاں نواز شریف کی تھی اس لئے پیپلز پارٹی نے لانگ مارچ کا فیصلہ کیا۔ لاہور سے اسلام آباد تک۔ اسلام آباد جا کر حکومتی دفاتر کا گھیراؤ اور حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مخالف پارٹیاں از خود مارچ نہیں کرتیں بلکہ ان سے ایسا کروایا جاتا ہے۔ جب مقتدر حلقوں کو اقتدار کی خواہش ہوتی ہے تو اس قسم کے ہتھکنڈوں سے راہ ہموار اور راستے آسان ہو جاتے ہیں۔ قوم کو ایک تاثر دیا جاتا ہے کہ حکومت نااہل ہے، غیر مقبول ہو چکی ہے، ملکی سلامتی خطرے میں ہے، معیشت دم توڑ رہی ہے اس لئے بامر مجبوری "میرے عزیز ہم وطنوں" کا اعلان کرنا پڑا ہے۔ یہ

طریق کار بہت پرانا ہے، یہ کھیل ایک طویل عرصے کھیلا جا رہا ہے۔

لانگ مارچ جس دن شروع ہوا اسی دن ختم ہو گیا۔ بڑے لیڈروں کو یہ سہولت رہتی ہے کہ اچانک کسی چوک میں اپنے جاں نثاروں کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ نعرہ بازی ہوتی ہے پریس کے فوٹو گرافروں کے کیمرے کلک کلک کرتے ہیں۔ فوٹو سیشن کے بعد وہ پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر کسی ریسٹ ہاؤس میں چلے جاتے ہیں اور لاٹھیاں، آنسو گیس، مار کٹائی اور جیل ورکروں کے حصے میں آتی ہے۔

لانگ مارچ والے دن سارے پنجاب کی انتظامیہ مستعد تھی۔ جی ٹی روڈ پر جو چند بسیں نظر آئیں ہم نے پکڑ لیں۔ ورکروں کو گرفتار کرنے کی نوبت ہی نہ آئی، وہ نعرے مارتے ہوئے بسوں سے اُتر کر دوڑ گئے۔ دوپہر تک یہ آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ کہیں سے اِکا دکا کوئی بس نظر آتی۔ مستعد پولیس اس پر "چیتے" کی طرح لپکتی اور "بزدل" احتجاجیے تتر بتر ہو جاتے۔ ہمیں ایک طرح کی مایوسی ہوئی۔ خیال تھا کہ جیالے تھوڑا بہت فٹ ٹائم ضرور دیں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہم حکومت کو مارچ کی ناکامی کی حتمی رپورٹ بھیجنا ہی چاہتے تھے کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہو گیا۔ بیگم نصرت بھٹو، غلام مصطفیٰ کھر، جہانگیر بدر اور اعتزاز احسن لاہور پولیس کو غچہ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ ایک بیجیر و میں بیٹھ کر لانگ مارچ کرتے پنڈی اسلام آباد جا رہے تھے کہ کامونکی میں پکڑے گئے۔ لاہور پولیس کی آنکھ میں کس طرح دھول جھونکی جس کا سربراہ رانا مقبول جیسا شاطر ڈی آئی جی تھا؟ اس نے اغلباً عمداً چشم پوشی کی کیونکہ بلند بانگ دعووں کے باوصف وہ ان سے ٹکرانا نہیں چاہتا تھا۔ زیادہ گزارا زبانی جمع خرچ پر کرتا۔ میاں صاحبان کو ایسے ہی لوگوں کی ضرورت تھی جو بول بچن میں سب سے آگے ہوں۔ حیرانی کی بات ہے کہ مرید کے میں شیخوپورہ پولیس نے بھی انہیں نہ روکا۔ ہر کوئی اس دردِ سر سے بچنا چاہتا تھا۔ پارٹی کی اعلیٰ قیادت مارچ کر رہی تھی۔ روکنے کی صورت میں تصادم کا خطرہ تھا۔

ہمیں سوچنے کا موقع ہی نہ ملا۔ پولیس نے سڑک پر بجلی کے کھمبے ڈال کر رکاوٹیں کھڑی کی ہوئی تھیں۔ جہانگیر بدر بیجیرو چلا رہا تھا۔ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا تھا کہ غلام مصطفیٰ کھر کے بعد بھٹو خاندان کی ڈرائیوری اس کے حصے میں آئی تھی۔ کھمبے کے پاس کھڑے ہوئے سپاہی نے رُکنے کا اشارہ کیا تو اس نے جیپ مزید تیز کر کے کھمبے پر چڑھا دی۔ گاڑی فضا میں اُچھلی تو پولیس کانسٹیبل مرتے مرتے بچا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ غصے میں کلاشنکوف کا پورا برسٹ جیپ پر مار دیا۔ نصرت بھٹو اور دیگر لیڈر کیسے بچے! یہ ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ گاڑی کے سارے ٹائر پھٹ گئے۔ تمام شیشے اور ونڈ سکرین چھلنی چھلنا کر چکنا چور ہو گئیں اور ایک گولی پھسلتی ہوئی سڑک کے دوسری جانب بیٹھے ہوئے چوہدری محرر کے پیٹ میں اُتر گئی۔ سوچتا ہوں کہ گولی نصرت بھٹو اور دیگر لیڈروں کو لگ جاتی تو کیا ہوتا؟ تمام ملک میں ہنگامے شروع ہو جاتے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو جاتا۔ شام تک فوجی بوٹوں کی دھمک چار سو سنائی دیتی اور ساری انتظامیہ پتہ نہیں کون سی جیل میں پڑی ہوتی۔

پارٹی لیڈروں نے سخت احتجاج کیا اور ہمیں دھمکی دی کہ قتل کا منصوبہ وزیراعظم کے ایما پر بنایا گیا

ہے اس لئے عنقریب ہی انتقام لیا جائے گا۔
پولیس نے ان سب کو پکڑ کر کاموکی کے تھانے کی حوالات میں بند کر دیا۔

مجھے پتہ چلا تو میں نے فوراً ملوکی ہیڈ ریسٹ ہاؤس کو سب جیل ڈیکلیئر کروا کے انہیں وہاں بھجوا دیا۔ نصرت بھٹو علیل تھیں اور بخار کی حالت میں اپنی دختر کے کہنے پر مارچ کر رہی تھیں۔ جب ملک اقبال اپنی نگرانی میں انہیں جیل سے ریسٹ ہاؤس لے جا رہا تھا تو وہ پھٹ پڑیں۔ غصے سے بولیں ”الو کے پٹھے! تمہیں کس نے ہمیں گرفتار کرنے کا حکم دیا ہے؟“

ملک نے نہایت سکون اور تحمل کا مظاہرہ کیا اور جواباً صرف اتنا کہا ”الو کے پٹھوں کو کسی حکم کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

شام کو میں انہیں ملنے گیا۔ نصرت بھٹو بیمار تھیں اس لئے پھولوں کا گلدستہ اور کیک لے گیا۔ پھول دیکھ کر وہ بیماری کی حالت میں کمرے سے باہر نکل آئیں۔ مجھے بڑے اخلاق سے ملیں۔ بولیں ”میں دیکھنا چاہتی تھی کہ پنجاب کا وہ کون سا ڈپٹی کمشنر ہے جو ایک معتوب اپوزیشن لیڈر کے لئے پھول لے کر آیا ہے۔“

میں نے کہا ”آپ کو گرفتار کرنا ہماری ڈیوٹی تھی۔ دیکھ بھال کرنا اخلاقی فریضہ ہے۔“

وہ سات دن وہاں رہے۔ اس عرصے میں وزیراعظم نے اظہر حسن ندیم کو فون کر کے کہا ”کھر کو پھینٹی لگائی جائے۔“ اس نے ہم سے مشورہ کیا۔

”بھول کر بھی یہ حرکت نہ کرنا۔“ میں نے تنبیہ کی۔

”تو کیا جواب دوں؟“

”کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے“

دوسری مرتبہ پھر میاں نواز شریف کا فون آ گیا۔ ڈی آئی جی بولا ”جناب کے حکم کی تعمیل ہو گئی ہے۔ بڑی ”گدڑ کٹ“ لگائی ہے۔

میاں صاحب خوش ہو گئے۔ کہنے لگے ”یہ ہندوستانی ٹینکوں پر بیٹھ کر پاکستان آنا چاہتا تھا۔“

ایک دن میں نے جہانگیر بدر سے پوچھا اس نے گاڑی کھمبے پر چڑھا کر اتنا بڑا رسک کیوں لیا ہے۔ جس سے سب کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ بولا ”بھا جی! لانگ مارچ سی، میں کیا، لانگ ڈرائیو کیتی جائے۔“

لیگی ممبران اسمبلی نے بڑا احتجاج کیا۔ انہیں گلہ تھا کہ اپوزیشن لیڈر کی معزز مہمانوں کی طرح خاطر مدارات ہو رہی ہے اور انہیں آٹھ کورسز کا ڈنر اور لنچ کھلایا جا رہا ہے۔ راجہ خلیق اللہ ممبر صوبائی اسمبلی نے تو باقاعدہ احتجاج کیا اور میاں نواز شریف کو مفصل رپورٹ لکھ کر بھجوا دی۔ رپورٹ میں اس بات کا خصوصی ذکر تھا کہ گوجرانوالہ کا سارا ڈرائی فروٹ ختم ہو گیا ہے۔

اعتزاز احسن بڑا خوش تھا۔ کہنے لگا ”ہمارا وزن چھ پونڈ بڑھ گیا ہے۔ اگلی مرتبہ بھی ہم نے لانگ مارچ کرتے ہوئے اس ضلع میں گرفتاری دینی ہے۔ ہم نے ہاتھ کھڑے کر کے کہنا ہے **Shaukat Shah!**

**come and arrest us**

سات دن کے بعد حکم آیا کہ اسیروں کو لاہور منتقل کر دیا جائے۔ رانا مقبول نے میاں صاحب کو یقین دلایا تھا کہ رہی سہی کسر وہ پوری کر دے گا۔ اب سادہ لوح لیڈر کو کون سمجھاتا کہ جو شخص ان کو بھگانے میں پیش پیش تھا وہ ”تر پولا“ کیسے کرے گا۔

[جاری ہے۔]

## مدد! مدد!

حد ہو گئی ہے ظلم کی مولا مدد! مدد
اے روحِ کُن! اے جانِ زمانہ مدد! مدد

بیمار ہیں، علیل ہیں، پیکر سے روح تک
اُمت کے بے مثال مسیحا مدد! مدد

اللہ کے حضور! اے اللہ کے حبیبؐ!
درکار صرف تیرا وسیلہ مدد! مدد

کس کی طرف ہو اُمتِ درماندہ کا رجوع
ہے کون اور یہاں پہ ہمارا، مدد! مدد

صدیقؓ اور عمرؓ کے وسیلے سے ہو قبول
عثمانؓ اور علیؓ کا حوالہ مدد! مدد

زہراؓ حسنؓ حسینؓ کے صدقے میں ہو کرم
اصحابؓ و اہلِ بیتؓ کا صدقہ مدد! مدد

کب ایسے نرم چارہ تھے اغیار کے لیے
خوں ایسے کب ہمارا سا سستا، مدد! مدد

بے خانماں ہیں..... ذات سے ہم کائنات تک
ہر حال، ہر مقام پہ، آقا مدد! مدد

ہو کون دستگیر اِس آشوب حال میں
اے بے کسوں کے ملجا و ماوا مدد! مدد

تنہائیاں وجود کی روحوں کو کھا گئیں
ہر ایک فرد خود میں ہے تنہا مدد! مدد

چھلنی ہے ایک ایک دل اِس ظلم و جور پر
ہر آنکھ میں ہے خون کا دریا، مدد! مدد

جیسے ہیں آج بے کس و نادار ہر جگہ
یوں کب تھے چشمِ دہر میں رسوا مدد! مدد

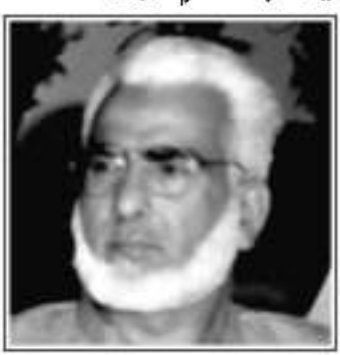

ریاض مجید

# اِسے کیا نام دیں

جلیل عالی

اِسے کیا نام دیں بولو
کہ تم
اُس نرسری کا
ذکر کرنے سے گریزاں ہو
پنپتی ہے پنیری
جس جگہ مسموم پودوں کی
اور ان مذموم باغوں کی
کہانی سے بھی
کترا کر گزرتے ہو
جو اِن پودوں کو
تن آور درختوں میں بدلتے ہیں
مگر باغوں کے مالک
جب خود اِن کی
سرکش و آزاد شاخیں کاٹنے
یا پھر جڑوں تک کھود کر
پورا جلا دینے
نشاں تک بھی مٹا دینے
کے رستے ڈھونڈتے ہیں
تو
تم ان کی ہم نوائی میں
قلم کے نو بہ نو گُر آزماتے ہو
منڈیروں پر
دِیے جب جلنے لگتے ہیں
مفاد و مصلحت کے
نحس جھونکوں سے بجھاتے ہو
اور اس پر بھی
نڈر بے باک اہلِ حرف کہلاتے ہو

## تسلسل

جھومتی ہے ہَوا تمبر کی
جیسے رائن کے خواب پہلو سے
بوڑھا نغمہ سُنا رہا ہو کوئی

ٹھہری ٹھہری سی وقت کی دھڑکن
ساحلِ شامِ جاں ہے اور دل میں
دُور تک ایک یاد پھیلی ہے

پھر شفق رنگ یاد کے پنچھی
کھو گئے رات کے اندھیروں میں
سُرمئی دائرے بناتے ہوئے

رات ہے تیرگی کا پہرا ہے
سرد تنہائی، خواب کی دہشت
خامشی ہے مرے تعاقب میں

## حامد یزدانی

## سوالیہ اندیشے

اِس خزاں کی نئی اداسی کا
رنگ کتنے برس پُرانا ہے
زندگی مسکرا کے پوچھتی ہے

اُجلی اُجلی سی صبح کی تتلی
کیوں چہکنے لگی ہے کھڑکی سے؟
کیا تصادم کا کھیل جاری ہے!

وہ ممالک کہ جن کے جھنڈوں پر
امن کی فاختائیں بیٹھی ہیں
جنگ کے گیت گا رہے ہیں وہی

سنگِ باراں کی تہہ میں کیا اب بھی
کل کی وحشی ہوائیں دبکی ہیں؟
جالیاں پوچھتی ہیں شیشوں سے

# تمنا کا چکور

رخشندہ نوید

دُکھ کا اِک احساس ہے یہ دُکھ نہیں
ذائقوں کا پھیکا پن اور بے قراری کی چبھن
منتظر آنکھوں میں جم کر رہ گیا رنگِ الم!
بے بہاری موسموں میں کھلنے والے
پیلے نیلے، اودھے پھولوں سے
تری خوشبو کے اُڑ جانے کا غم!
دِل میں پیدا ہونے والے، وسوسے،
خدشات
دھڑکے، خوف کا بے نام شور
اِک تمنا کا چکور

جو کسی مہتاب کی جانب سفر کرتا نہیں
اِس سے پہلے کچھ نہیں
بعدِ سفر بھی کچھ نہیں!
دُکھ کا اِک احساس ہے
یہ دُکھ نہیں
اب مرے دِل پر کسی غم کا اثر بھی کچھ نہیں

# خدا سو رہا ہے

نیلم احمد بشیر

اتنی گہری نیند کہ
بموں کی گھن گرج، دھماکوں کے شور سے بھی نہیں جاگتا
پھول بچوں کی چیخوں، آہوں، دہائیوں سے بھی
اسکی آنکھ نہیں کھلتی
خدا، تو آسمان سے ذرا نیچے اُتر کر دیکھ تو سہی
بربادی اور تباہی کے کڑوے ذائقوں سے
زندگی کتنی زہریلی ہو چکی ہے
گھر گھر میں بین ہے، ماؤں کے سینوں میں
دودھ میں انگارے بھر گئے ہیں
ملبے کے ڈھیروں میں کتنی نسلوں کی
کہانیاں دفن ہو چکی ہیں
ہاں خدا ہم جانتے ہیں کہ تیرا آسمان بہت اونچا،
اتنا اونچا کہ وہاں تک فریاد اور گریہ زاری کا کوئی بم
کوئی راکٹ، کوئی میزائل نہیں پہنچ سکتا
پھر بھی ہم ہواؤں میں مہکتے بوسے
اور دعائیں اچھال رہے ہیں
شاید تو جاگ جائے
سنا تو یہ تھا کہ
تجھے نہ نیند آتی ہے نا اونگھ

# نثری نظم

محبت کی عمر تھوڑی تھی

یا پھر منافقت کی فضا آلودگی میں سانس گھٹنے سے

وقت سے پہلے ہی مرگ

رد کر دینے سے بھی بڑا دکھ

چاہت میں ملفوف دنیاداری ہے

جب تک دنیاداری اور محبت کا فرق سمجھتی

دیر ہو چکی تھی سو

محبت کو فراموشی کی قبر میں اتار دیا

وقت بچھڑ جانے والوں کی یاد کا سب سے بڑا مرہم ہے

کوئی بھی یاد نا دیر قائم نہیں رہتی

محبت کا دوسرا جنم ممکن نہیں

دروازہ کھلا بھی ہو

ہوائیں پیامبر بن کر نہیں آتیں

مکان دیر تک خالی رہے تو اس میں آسیب بسیرا کر لیتے ہیں

ویرانیاں اک بار دل میں گھر کر جائیں تو پھر دل آباد نہیں ہو پاتے

بیحسی سب جزبوں پر حاوی ہو جاتی ہے

نائیلہ راٹھور

# کرچیاں

جب اس نے درد کو پہنایا
اک ہوک اٹھی دل آنگن میں
میں ریزہ ریزہ جسم لیے
کچھ دیپ جلا کر بیٹھ گیا
کچھ خواب سجاؤں من چاہا
پر خدشوں نے پھر گھیر لیا
وہ خواب نہ واپس لے جائے
پھر درد نہ مجھ کو دے جائے
میں تنہا تنہا پھرتا ہوں
میں بکھرا بکھرا رہتا ہوں
کچھ پھول لئے میں ہاتھوں میں
کچھ انجانی سی راہوں میں
پھر کس کی آشا ساتھ لیے
میں قریہ قریہ پھرتا ہوں
وہ یاد نہیں کیوں روٹھ گیا
نہ میں جانا نہ وہ مانا
اب خود سے روٹھا رہتا ہوں
اب ساری دل کی باتیں میں
خود اپنے آپ سے کہتا ہوں

افتخار شوکت

# نظم

کوکھ

یہ بانجھ کب تھی!

برہنہ کرنے کو اس زمیں پر جو ہل چلایا

تو بیج سے حاملہ ہوئی ہے

میں اس پر بوئے ہوئے شگوفوں کو اپنی تخلیق کہہ رہا ہوں

میں اپنے بیٹوں کی بے رخی

اور اپنی بیٹی کی رخصتی کے تمام دکھ بھی انھیں سناتا

جو میری نظموں میں آ چکے ہیں

مری ہزیمت کی داستانوں کو کون سنتا

مگر یہ کالی گھٹائیں، بارش.....

ابارشن پر تلی ہوئی ہے

زعیم رشید

# بے نام رعایا کے دُکھ

تقریباً
سبھی کردار

برہنہ
واضح سطروں کی طرح
ذہنوں میں روشن
طاقت کے مختلف استعارے
تاریخ سے
تشبیہ اور تلمیح کے معتبر حوالے
نجانے کتنے مناظر
جا بجا رنگوں میں بکھرے
پُراسرار مدھم
چمکتے دکھائی دیتے ہیں
کہیں سے
اُمید کا پرچم لہراتے ہوئے
مایوسی کی رات سے
نئے دن کا آغاز جنم لے
کبھی تو
گم شدہ آوازیں
ہمیں پکاریں
سوکھے لبوں پہ زندگی
توازن کا ردھم آئے
کبھی تو
ہمارے خواب

دلائل کی بود و باش
ثبوت کی تہذیبی آویزش سے
ہم آہنگ ہوں
مگر ہمیں تو
نحوست کے کالے کھونٹے سے
باندھ کر رکھا گیا ہے
یہاں تک کہ
ایک روز
موت کا فرشتہ
ہماری زندگی کے خاتمے کا اشتہار
زمین پر چسپاں کر جاتا ہے

امجد بابر

# نظم

اپنی خالی کی خالی ہی تھالی رہی
اپنی ہستی ہمیشہ سوالی رہی

آ کے بیٹھا تھا پنچھی ذرا کی ذرا
کانپتی دیر تک ایک ڈالی رہی

جھانکتی تھیں نگاہیں دو سہمی، ڈری
ہر محلے میں کھڑکی پہ جالی رہی

یاد اُس کی جو آئی دیے جل اُٹھے
ذہن میں اپنے شب بھر دوالی رہی

عید کے بعد بھی ہاں کئی روز تک
ہاتھ پر مہندی، کانوں میں بالی رہی

عشق کے ظالمانہ مراحل میں بھی
اُس کی صورت بہت بھولی بھالی رہی

لفظ نے مات دے دی مری موت کو
بعد سورج کے تا دیر لالی رہی

غلام مرتضیٰ

# نظم

چاند میری جھونپڑی کی اوٹ میں سونے چلا
چاندنی اب بٹ چکی
اب روشنی لونشس سے
اس کی کرنوں میں
نیا رستہ تلاشو، جاگ کر
یاد کر لو شب میں ٹوٹے
کچھ جدا سے ہو گئے
لوگ جو یوں سرد سی بے تاب سی، وہ چاندنی
تاب لانے سے ڈرے، اٹھ کر گئے
ان کے لیے
ہر کرن کر لو جمع
پھر کھوج میں جاؤ سبھی
عین ممکن ہے بے چاروں کا بدن خالی ہی ہو
لمس پر اک سردسی، پر درد سی بس آہ ہو
کیا خبر وہ چاندنی کو ندی ہوا ایسے جیسے، تف
جو عیاں کرتی ہے ہر کردار کو معیار کو
وہ گزشتہ شب
سرِ شب لوٹنے والے ، کہیں
عشق کے ملعوں نہ بن جائیں
پتہ کر لو ابھی
جلد جاؤ تم سبھی
سورج مدد گاری کرے
معجزہ باری کرے
کرنوں کا تن زاری کرے

ساگر حضور پوری

# نثری نظم

کہا تھا نہ کہ تم بھی!
زمانے کی طرح مت ہو جانا--
کہ زمانے کا کام ہے پیٹھ پیچھے وار کرنا
پھول سے چہرے کو کانٹوں کا ہار کرنا
بے اعتبار کرنا
بے بس و لاچار کرنا
کہ یہ بیچ راستے
اندھیروں کا مسافر کر کے
ادھ موا چھوڑ جاتا ہے
تمام رشتوں سے منہ موڑ جاتا ہے
کہا تھا نہ----
میں نے اپنے بکھرے وجود کے ٹکڑے
مشکل سے سمیٹے ہیں
ذرہ ذرہ پھر سے سینچا ہے
تم ان کو بکھرنے مت دینا
مجھے سمیٹ لینا
غم کو راستہ مت دینا
خوشیوں کو لپیٹ لینا
مگر یہاں تو سب تدبیریں الٹ گئیں
تم نے سب سنا ان سنا کر دیا
بکھرے وجود کے ٹکڑے چنتے چنتے
اندھی آنکھوں سے خواب بنتے بنتے
میں کیوں بھول گئی--؟؟
بھلا ٹوٹی ہوئی چیز بھی جڑتی ہے؟
دراڑیں تو دراڑیں ہی رہتی ہیں---
اور دراڑیں کب بھرتی ہیں؟
کہا تھا نہ کہ تم بھی!
زمانے کی طرح مت ہو جانا
زمانے کی طرح مت ہو جانا

فرح شاہد

# ہمارا دکھ ہے

ہمارا رونا نہیں کہ ہم نے محبتوں کو مقام دینے میں بخل برتا
یا ارتکابِ گناہ کر کے بنے ہیں مجرم
نہ دل ہمارے ہیں تنگ
نہ اوڑھا ہم نے منافقت کا لبادہ
وفا شعاری رگوں میں جاری
لہو کی صورت
ہمارا شیوہ
ازل ازل سے
بلندی، پستی بھلا کے ہر اک
محبتوں کو دوام دینا
حسین جذبوں کو خونِ دل کا سلام دینا
کہاں کسی اور کی سمجھ میں آئے
جو ہم نے خود ہی بسا رکھا ہے
ہمارا دکھ ہے
کہ فرض کر کے چلے ہوئے ہیں
کہ مل کے بھی ہم
نہ مل سکیں گے
وہ پھول جن کی ہم آبیاری
بھی زمانوں سے کرتے آئے
زمینِ دل پر نہ کھل سکیں گے
اسی کا خمیازہ ہے مزاج اپنا
جو ایک ہی وضع پر نہ ٹھہرے
اسے اور کوئی سمجھے کیسے
ہمارا دکھ ہے
حصارِ مجبوریوں کے لے کر چلے ہوئے ہیں
ہیں بیڑیاں پاؤں میں ہمارے
اگرچہ ہیں دست و پا سلامت
تمام رستے کٹے ہوئے ہیں
یہ فرض کر کے چلے ہوئے ہیں
کہ پیار کر کے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں
یہی سبب ہے
محبتوں کے مزاج میں ہم
نہ ڈھل سکے ہیں
نہ ڈھل سکیں گے
ہمارا دکھ ہے
کہ اب بھی دنیا کے رنگ میں ہی رنگے ہوئے ہیں
ہمارا دکھ ہے
کہ ایک دوجے سے فاصلوں کو سمجھ کے لازم
رواں دواں ہیں
جہاں جہاں ہیں
دھواں دھواں ہیں
حقیقتیں بھی گماں گماں ہیں
ہماری کمزوریاں ہیں
جنہیں ہماری محبتوں نے
زمیں پہ پختہ نہ سر چڑھایا
سو جس کو جاں سے عزیز سمجھا
گلے لگایا نہ انتہائے طلب کی دیکھی ہے ہم نے منزل
سمجھ سکے نہ ہم بھی جس کو
یہ کیسا دکھ ہے
نرالا دکھ ہے
ہنساتا اور رلاتا دکھ ہے
ہمارا دکھ ہے

عنبرین خان

# سیّد آلِ احمد کے لیے ایک نظم

نوید صادق

انگلی تھام کے راہ دکھانے والے
گن چُن کر اِس دنیا میں
تم بھی سوچو
میں بھی دیکھوں
کتنے ہوں گے؟

وہ جو ایک اکیلا.....!!
رنج بھرے حالات میں بھی
اِس مصروف چوراہے پر
چہرے پر مُسکان کھلائے
رنگِ دنیا دیکھتا تھا
اندر اندر خود سے الجھتا رہتا تھا
وہ جو ایک اکیلا
بڑے بڑوں کے ہوتے پورے شہر پہ حاوی تھا
اچھے برے حالات میں اپنے قول و فعل میں
سارے شہر میں یکتا تھا
آج بھی شہر کی بھری پُری اِن سڑکوں پر
آتے جاتے اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے
لیکن مَیں
شہر کی سڑکوں پر تنہا، آوارہ ہوں
چائے کے اِس کھوکھے پر مَیں کب تک تنہا بیٹھ سکوں گا
کون مجھے بتلا سکتا ہے؟
شعر کہوں تو کس کو سناؤں؟
کس سے داد سمیٹوں؟
کس کی ڈانٹ سہوں؟

جناب احمد فراز اور جناب سلطان سکون

جناب سلطان سکون جناب منیر نیازی کے ساتھ

جناب اسلم کمال اور جناب سلطان سکون

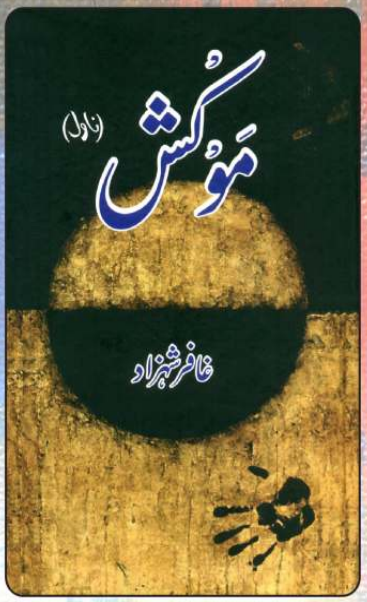

مَوُکُش
(ناول)
غافر شہزاد

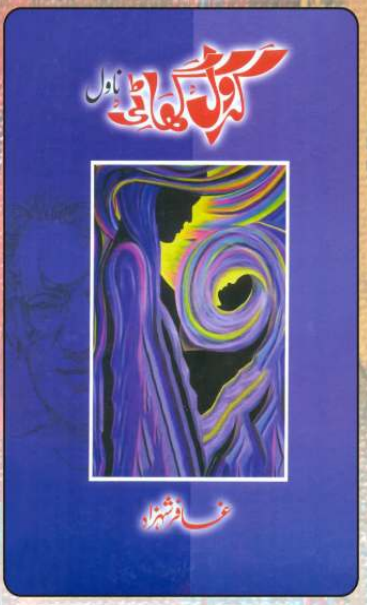


کوڑی گھاٹی
ناول
غافر شہزاد

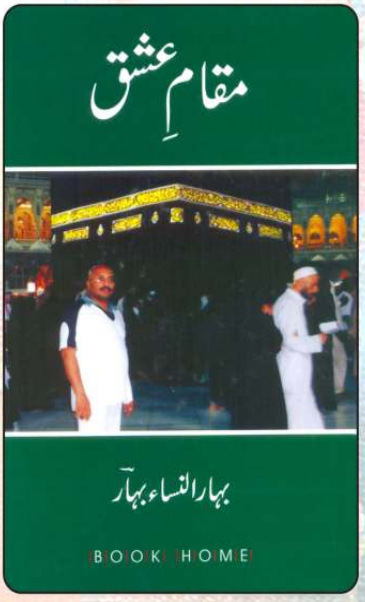


مقامِ عشق
بہار النساء بہار
BOOK HOME

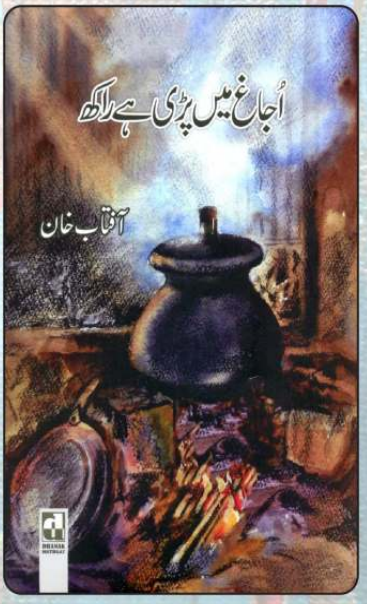


اُجاغ میں پڑی ہے راکھ
آفتاب خان